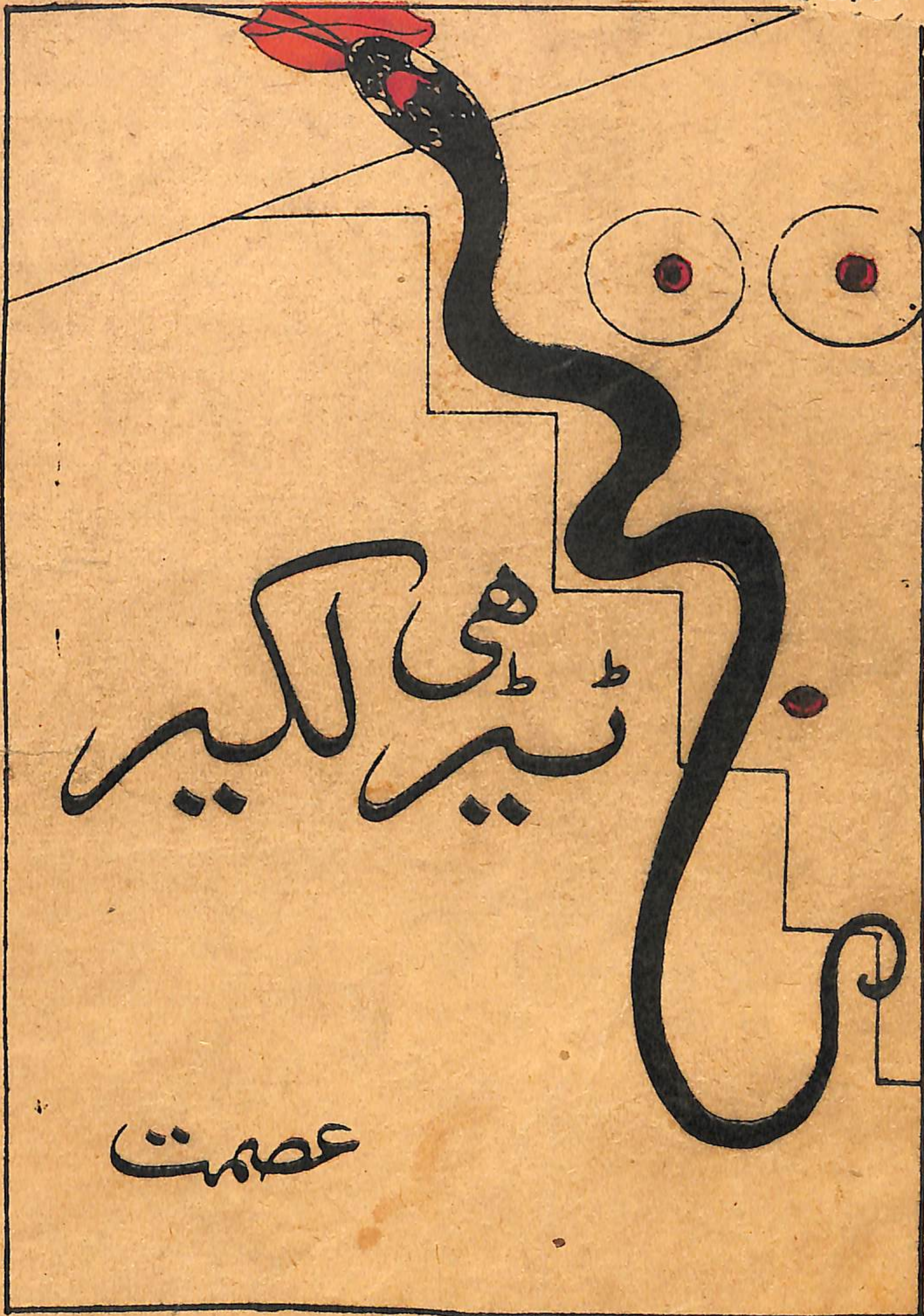
MAY, 1946

Shrimant

ادب لطیف

ریشمی تاروں کو اس طرح کیوں بکھیر رہا ہے ...



ادب لطیف

MAY,
1946

Brij Mohan Puri Esqr

جلد ۲۳ - شمارہ ۲

لکھنے والے

اثر لکھنوی — عبادت بریلوی

ابوالفضل صدیقی — چوہدری شیر جنگ

ڈاکٹر محی الدین زور — مخمور جالندھری

خالدہ ندیم — سرلا دیوی

Annas
-/8/-

مکتبہ اردو

ادارہ

اشارات

سالنامے کو ہر اس ذہین اور صحت ور انسان نے سراہا، جو ادبی ارتقاء کو زندگی کا ارتقاء سمجھتا ہے۔ ارتقاء کی اس مسرت انگیز کیفیت میں ادارۂ ادبِ لطیف بھی آپ کے ساتھ شریک ہے۔ سماج کے تخریبی عناصر کو خوبصورت سانچوں میں ڈھالنے کے لئے ادارہ کی یہ مساعی متواتر جاری رہیں گی جب تک حسن و طمانیت کی گھڑیاں انسان کے قدم نہیں چومتیں۔ جب تک خارجی اور داخلی خلفشار سے ہمارا گردوپیش گلوخلاصی نہیں کر پاتا۔ ہم ادب کے تنوع اور افادی پہلوؤں کو پیش کرتے رہیں گے۔ چہ جائیکہ یہ تنوع، یہ افادیت ہمارے رجعتی نمائندوں کو مرغوب نہیں۔ لیکن وقت کے تقاضے ایسی رغبتوں کی احتجاجی آوازوں کو سُنے بغیر اپنی منزل کی طرف مسلسل و پیہم قدم بڑھاتے رہیں گے۔ وقت کا تند اور سیلابی دھارا آخر کیوں کسی کا انتظار کرے؟

گذشتہ کئی سالوں سے "مختصر افسانہ" اُردو کی ادبی فضاؤں پر کچھ اس ظفرمندانہ اور پیش رو حیثیت میں مسلّط رہا کہ ادب کی بیشتر اصناف کو پیچھے چھوڑ گیا۔ ہیئت اور تکنیک کے نت نئے تجربات نے اس کے فنی خدوخال پر گوناگوں لکیریں کھینچیں۔ سانچے بدلتے گئے، نظریئے بدلتے گئے، تقاضے بدلتے گئے، اور ان سب کے ساتھ ساتھ افسانوی فن کے رنگ بھی بدلتے گئے —— اور اگرچہ ان مختلف رنگوں سے افسانے کی مانوس فنی قدروں کو ٹھیس ضرور لگی۔ لیکن اُردو ادب مالا مال ہو گیا۔ ادب اور زندگی کے رشتے چاروں جانب سے اُستوار ہوتے گئے۔ زندگی کے نوع بہ نوع زاویوں کو افسانے کے نوع بہ نوع زاویوں نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور ہمارا افسانہ دُنیا کے ترقی یافتہ افسانوں سے آنکھیں ملانے لگا۔

افسانے کے ان ہیئتی اور تکنیکی سیلابوں کا ایک ردِ عمل یہ بھی ہوا کہ ہمارے فن کاروں کے ہاتھ سے ادب کی بہترین صنف "ناول" کی باگ ڈور چھوٹ گئی۔ اگرچہ بعض فن کاروں نے اس سیلابی دَور میں کبھی کبھی پیچھے مُڑ کر اس صنف کی بے سروسامانی پر آہِ سرد بھی کھینچی۔ اور اپنی بے ساختہ رفتار کے دَوران میں کئی مرتبہ ہلکے ہلکے سنبھالے بھی دیئے۔ تاکہ اس صنف کو بھی ادبی سفر میں اپنے ہمراہ رکھ سکیں لیکن طوفان اس قدر تیز تھا۔ کہ ان ہلکے ہلکے سنبھالوں سے کچھ نہ بن پڑا۔ اعلانات ہوئے، لکھنا بھی شروع کیا گیا۔ مگر مختصر افسانے کے ظفرمند تازی نے سبھوں کو اپنے گردوغبار کی لپیٹ میں لے لیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ ناول منہ دیکھتا رہ گیا۔ اور وہ رجعت پسند فن کار جو مختصر افسانے کی بجلی کی سی انوکھی چالوں کا ساتھ نہ دے سکے اور میلوں پیچھے ستانے، پچھتانے اور ہانپنے کے لئے رہ گئے تھے۔ اس غریب الدیار، لاوارث صنف "ناول" کی طرف چل پڑے۔ جنگ کے دن تھے۔ یک وقت پست و بلند لٹریچر کی مانگ زوروں پر تھی۔ چنانچہ اس ادلتی بدلتی فضا میں کئی ایسے غیر معیاری اور سطحی نوعیت کے ناول معرضِ وجود میں آنے شروع ہو گئے، جن میں افادیت کم اور انتقام زیادہ تھا۔ ترقی پسند فن کاروں نے جس میدان کو کھُلا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں بے موقع شناس رجعتیوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اور ادبِ عالیہ کے مرغزار کی بجائے بچارا "ناول" جھاڑ جھنکاڑ میں الجھ کر رہ گیا۔ اُردو ادب کو غیر ممالک کے ترقی یافتہ لٹریچر کے ہم پلّہ کرنے میں افسانہ تو بازی لے گیا۔ لیکن ناول پیچھے رہ گیا حالانکہ دورانِ جنگ میں غیر ملکی فن کاروں نے وقت کے بہترین ناول تخلیق کئے۔ اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ غیر ملکی ادب افسانہ کے ارتقائی مراحل سے گذر کر ناول کے دَور میں داخل ہو چکا تھا —— مختصر افسانے کو عارضی تلانجلی دیکر ناول پر اپنی فنی قوتیں صرف کرنے والے معیاری فن کاروں میں ایک عصمت چغتائی بھی ہیں جنہوں نے اس مضطرب اور بیقرار عہد میں بھی اپنا ناول "ٹیڑھی لکیر" مکمل کیا۔ اس کے کئی ابواب ملک کے سامنے آ چکے ہیں۔ جن سے فن کار کی وسعتِ نگاہ، ماحولی ترجمانی اور تکنیکی گرفت کا اندازہ لگا کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول اُردو ناول کے جدید دَورِ عالیہ کے لئے نشانِ راہ کا مرتبہ حاصل کریگا۔ اگر اس نشانِ راہ کے ظہور میں خداوندانِ کاغذ کی چٹانیں حائل نہ ہوتیں۔ تو "ٹیڑھی لکیر" دورانِ جنگ کی لافانی تخلیق شمار کی جاتی —— بہرکیف ادارہ مکتبہ اُردو ان چٹانوں کو پاش پاش کرنے کا تہیّہ کر چکا ہے۔ اور عصمت کے اس نشانِ راہ کی نقاب کشائی کرنے میں جلد کامیاب ہو گا۔

لیکن ہمیں اسی پر بس نہیں کرنا چاہئے۔ اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور مختصر افسانے کے رنگ روپ سے ذہنوں میں ایک اُکتاہٹ سی آ چکی ہے اور ناول کی اعلیٰ ترین صورتوں کے لئے مطالبات بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمارے فن کاروں کو بھی ایک کروٹ لینی چاہئے۔ اور عصمت کی طرح اردو ادب کے اس جھاڑیوں سے اٹے ہوئے میدان کو شاداب مرغزاروں میں تبدیل کر دینا چاہئے۔

محمود جالندھری

مختصر نظمیں

دھنک:

ساتِ رنگوں سے بھری پچکاری
کس نے ملبوسِ فلک پر ماری ——؟

شبنم:

اُگ آئے ہیں موتی ہری گھاس پر
گہر چینِ مشرق ابھی آئے گا
اُٹھا کر اِنہیں دُور مغرب میں لے جائے گا

دو اُفق:

مغرب کا اُفق —— غارتِ انوارِ جہاں تاب
مشرق کا اُفق —— خالقِ انوارِ سحر ہے

رات:

فلک نے لکھتے ہوئے آفتاب کی رُوداد
انڈیل دی ہے سیاہی زمیں کے چہرے پر

بیاہ کے ایک سال بعد:

تیرے بالوں سے مہک آتی تھی
تیرے گالوں میں دیئے جلتے تھے
تیری سانسوں سے شرر جھڑتے تھے
تیرے ہونٹوں میں رسیلا خم تھا
تیری آنکھوں میں تو میخانے تھے ——
کیوں جگاتی ہے مجھے —— کون ہے تُو؟

حُسن:

گزر رہا تھا ابھی کون سڑک سے کہ، ابھی تک
ہاتھوں میں ہے بلنے کے اُسی طرح ترازو
درزی کی سوئی پہلے جہاں تھی، ہے وہیں پر

مجید امجد

ابھاگن

آگ لینے آئی جب کوئی پڑوسن شام کو
یُوں چچی نے وا کیا اپنے لبِ دُشنام کو
اُس موئی پاپن نے تو مجھ کو جلا ڈالا، بہن!
کوئی ہو اس بے حیا سے پوچھنے والا، بہن!
یہ نگوڑی کیوں گلی کے موڑ پر، کل پچھلی رات
کر رہی تھی جانے کیا سرگوشیاں! اور کس کے سات؟
وہ بچاری آلوؤں کو چھیلتی بے اختیار
ہاتھ میں اپنے چھوٹی چھُری کی تیز دھار
صُبح کو گونجی فضا میں جب کسی بنسی کی لَے
اُس کے سینے میں تڑپ اُٹھی کوئی بیتاب شے
ہاتھ سے چلتی ہُوئی چکّی کا دستہ چھٹ گیا
اک جہاں اس کے تصوّر میں بسا اور لٹ گیا
اتنے میں ظالم چچی کی غیظ ناک آواز پر
جھک گئی پھر سے وُہ سنگِ آسیا کے ساز پر
کیوں نہ ہو اس دُکھ کی ماری کے لئے جینا وبال
اک چچی کے ہاتھ میں ہو جس کے گھر کی دیکھ بھال
باپ جس کا کارخانے میں کہیں مزدُور ہو
اپنی اکلوتی جوان بیٹی سے کوسوں دُور ہو
جس کی ماں پھر لوٹ کر فردوس سے آئی نہ ہو
وُہ ابھاگن، جس بچاری کا کوئی بھائی نہ ہو

سیف الدین سیف

غزل

آئے تھے اُن کے ساتھ نظارے چلے گئے
وُہ شب وُہ چاندنی، وُہ ستارے چلے گئے
کشتی تڑپ کے حلقۂ طوفاں میں رہ گئی
دیکھو تو کتنی دُور کنارے چلے گئے
شاید تمہارے ساتھ بھی واپس نہ آسکیں
وُہ ولولے جو ساتھ تمہارے چلے گئے
ہر آستاں اگرچہ ترا آستاں نہ تھا
ہر آستاں پہ تجھ کو پکارے چلے گئے
شامِ وصال خانۂ غربت سے روٹھ کر
تم کیا گئے نصیب ہمارے چلے گئے
محفل میں کس کو تابِ حضورِ جمال تھی
آئے تری نگاہ کے مارے چلے گئے
جلتے ہجومِ حشر میں ہم عاصیانِ دیر ؟
اے لُطفِ یار تیرے سہارے چلے گئے
دیکھا تو پھر وہیں تھے چلے تھے جہاں سے ہم
کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے چلے گئے
دشمن گئے تو کشمکشِ دوستی گئی
دشمن گئے کہ دوست ہمارے چلے گئے
جاتے ہی اُن کے سیفؔ شبِ غم نے آلیا
رخصت ہوا وُہ چاند ستارے چلے گئے

اثر لکھنوی

غزل

اثرؔ آنکھ اب تک خماری نہیں
ترے بس کی پرہیزگاری نہیں
تجھے کیا خبر عشق کیا چیز ہے
کبھی جیتی بازی تو ہاری نہیں
میں دل باختہ ہوں وُہ صبر آزما
کوئی شکل مطلب برآری نہیں
مئے یاس ہے جامِ اُمید میں
جبھی رنگ پر بادہ خواری نہیں
شکستوں کا احساس ہے اور دل
ابھی شیشے پر ضرب کاری نہیں
نہ ہو غم تو پھر عیش کا کیا مزا
نشاطِ ابد اعتباری نہیں
نہ اُس کی خطا ہے نہ میری خطا
وفا یا جفا اختیاری نہیں
فلک پر ستارے ہے، مژہ پہ سرشک
وُہ راتیں، وُہ اختر شماری نہیں
اثرؔ کیوں نہ بڑھ بڑھ کے باتیں کریں
کسی دشمنِ جاں سے یاری نہیں

چوہدری شیر جنگ

سماجی سائنس میں کارل مارکس کا حصّہ

اپنی شہرہ آفاق کتاب داس کیپٹل (سرمایہ) کو شائع کرتے وقت کارل مارکس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ یہ وہ کتاب ہے جس کی تصنیف میں میں نے اپنی صحت تباہ کی ہے۔ اور اپنی ان مسرتوں کو قربان کیا ہے جن کا ہر شخص اپنے بال بچوں سے اور اپنی زندگی سے متمتع ہوتا ہے اور کم و بیش حاصل کرتا ہے۔" (مکتوبات مارکس اینگلز، ترجمہ انگریزی صفحہ ۲۱۹)

انتہائی درجہ کا افلاس، بیماریوں کے بار بار حملے، دو دو ہونہار بچوں کی موت۔ دن رات کی محنت شاقہ سے محبوب بیوی کی صحت کی تباہی۔ گھر بار کی ویرانی، دوستوں کی دشمنی، فاقے، تنگدستی اور جلاوطنی؛ یہ تھی وہ قیمت جو کارل مارکس نے تیس سال کی ان تھک محنت کا حاصل اپنی اس سماجی سائنس کو وجود میں لانے کے لئے ادا کی تھی۔ جو کہ آج صحیح طور پر اس کے نام سے معنون مارکس ازم کہلاتی ہے۔ شاید کسی بھی چیز کا جنم، خواہ وہ سائنس ہی کیوں نہ ہو؛ انتہائی تکلیف دہ اور روح فرسا لمحوں کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

مارکس، اینگلز نیز ان لوگوں کی محنت شاقہ کا حاصل، جنہوں نے کہ اول الذکر ہر دو مفکر انقلابیوں کے دریافت کردہ اصولوں اور کلیوں کی روشنی میں، اپنے خیالات کو جلا دی۔ آج ہمارے سامنے واقعات پر پرکھی ہوئی حقیقتوں کا ایک مجموعہ، بار بار کے تجربے سے استخراج کئے ہوئے نتائج اور ایک ایسا اسلوب، منہاجیات کا ایک ایسا ضابطہ بن کر موجود ہیں جن کی صداقت کا ثبوت آج تک کی سماجی تاریخ اپنے ہر دور میں ہر قدم کے ساتھ پیش کرتی آئی ہے۔ بنی نوع انسان کے ان محسنوں کی ودیعت آج ایک باضابطہ سماجی سائنس کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کی روشنی ہمارے راستے کے اندھیرے کو دور کر رہی ہے۔ اس کی موجودگی میں اگر ہم آج بھی بھٹکتے پھریں۔ یا ان روڑوں سے ٹھوکریں کھاتے چلیں۔ جو ہمیشہ سماجی تبدیلیوں کے راستے کی الجھنیں پیش کیا کرتی ہیں۔ تو اس کی ذمہ دار ہماری اپنی کورچشمی ہوگی۔ روشنی کا فقدان نہیں۔ یہ مارکس اور اینگلز کی زندہ جاوید عظمت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو مستقبل کے اس سماجی نظام کے بنیادی نقوش کا پتہ لگایا۔ اور ان کا اعلان کیا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لے سکتا ہے۔ اور دوسری طرف ان بنیادی طریقوں اور اسلوبوں کو دریافت کیا جن کو روبکار لاکر اس نئے نظام کو قائم کیا جا سکتا ہے

سماجی تبدیلیوں کی ہر تحریک کے لئے اس سائنس کا علم آج اتنا ہی ناگزیر ہے۔ جتنا ریاضی کے لئے ہندسوں کا علم۔ نئے سماج تک پہنچنے کے لئے اس سائنس کی روشنی اتنی ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ محبت کے لئے باہمی اعتماد۔ اس کے بغیر ہماری ہر تحریک ان بھول بھلیوں میں آ الجھے بغیر، ان تباہ کن خندقوں میں گرے بغیر نہیں بچ سکتی۔ جن میں انگلستان کی چارٹسٹ تحریک سے لے کر ہمارے ملک کی ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور دورِ حاضرہ کی تینوں کانگرسی تحریکیں گر چکی ہیں۔ پچھلی نصف صدی میں پے در پے تجربہ کے بعد یہ بات اچھی طرح پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سرمایہ دار درندوں کے خلاف بغاوت کی ہر انقلابی تحریک اس وقت تک نہ صرف کامیاب ہی نہ ہو سکی بلکہ انقلاب کا مقصد تک سمجھنے سے قاصر رہی جب تک کہ مارکس کے دریافت کردہ اصولوں کو اس نے نہیں اپنایا اور ان کی روشنی میں اپنا پروگرام مرتب نہیں کیا۔ ہر جگہ اور ہمیشہ، جہاں جہاں بھی مزدور تحریک نے ان اصولوں سے روگردانی کی ہے۔ ناکامیابی کے آنسو اور شکست کی تباہی ہی انجام کار اس بدنصیب کے حصّہ میں آئی۔ تاریخ اس بات کا عملی ثبوت بہم پہنچا چکی ہے۔ کہ آزادی کی جدوجہد میں محض اسی مزدور تحریک کو کامیابی نصیب ہوئی۔ جس نے سرمایہ دارانہ نظام میں اپنی جگہ اور اپنی طاقت کو پہچانا اور جس نے اپنے اندر اپنی ایک ایسی سیاسی پارٹی کو جنم دیا جو مارکس، اینگلز اور ان کے ذہنی ورثاء کے بتائے ہوئے اصولوں کی روشنی میں یہ سمجھنے

کی صلاحیت رکھتی تھی کہ کس طرح سرمایہ داری کی خونی عمارت کو منہدم کیا جا سکتا ہے اور اُس کی جگہ کس طرح سوشلزم کی دنیا آباد کی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ مارکس ازم پر ایمان لے آنا ہی مزدور تحریک کی کامیابی پر مہر صداقت ثبت کر دیتا ہے۔ وہ سماجی سائنس جس کے بنیادی اصول مارکس اور اینگلز کے مرہونِ منت ہیں۔ ابھی خود اپنے ابتدائی مرحلوں میں ہے اور ہر خورد سال سائنس کی طرح اپنے موضوع کو مناسب اور موزوں تضمین کے ساتھ معتبر اور ہمہ گیر کلیوں میں پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس سائنس سے کام لینے کے لئے انتہائی ذہانت، مصمم ارادہ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ نہیں تو ذرا سی غلطی اس کے پیرؤں کو جرمنی کے مارکسی علماء کی طرح گڑھے میں گرا دیتی ہے۔ تاہم اس کی اس خورد سالی کے باوجود بار بار کے تجربے نے جس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچایا ہے۔ اور جو بات اب پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ سائنس اپنے استعمال کرنے والوں کی کامیابی کے لئے ضامن نہیں بن سکتی۔ لیکن کوئی بھی ایسی منظم تحریک جس کی مراد موجودہ سماج کو تبدیل کر کے بہتر قسم کے سماج کا قائم کرنا ہو۔ اس وقت تک ہرگز بھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔ اور اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ تحریک اس سائنس کی مدد نہ لے اور اس کی روشنی سے اپنے راستے کو منور نہ کرے۔

اس جدید سائنس کو ہم آسانی سے "سماجی حرکیات" (Social Dyanamics) کا نام دے سکتے ہیں کیونکہ اُن سائنسوں کے بخلاف جو کہ سماج کے موجودہ اداروں کی محض تشریح ہی کرتی ہیں۔ اور جن کو "سماجی سکونیات" (Social - Statics) کہا جا سکتا ہے۔ یہ سائنس مقدم طور پر اُن قوانین کے مجموعہ پر مشتمل ہے۔ جو کہ یہ بتاتے ہیں کہ سماج کے اندر تبدیلیاں کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہیں؟ کیوں ہوتی ہیں؟ اور کس سمت میں ہوتی ہیں۔ ہم یہ پھر دہراتے ہیں۔ کہ سماجی حرکیات ایک جدید ترین اور انتہائی خورد سال سائنسوں میں سے ایک سائنس ہے۔ ایسی سائنس جس کے ابتدائی اصول کوئی نصف صدی کی بحث و تمحیص و چھان بین اور سماجی زندگی کے ہر شعبہ میں بے شمار تجربوں کے بعد حال ہی میں مصدقہ اور مسلمہ مانے جانے لگے ہیں۔ حیاتیات اور طبیعات کے مقابلے میں یہ سائنس آج بھی ابھی ابتدائی نشوونما کے دور میں سے گزر رہی ہے۔

مذکورہ بالا دونوں سائنس یعنی حیاتیات اور طبیعات اپنے اپنے دعووں کی مخالفت کا جو دور بہت پہلے عبور کر چکی ہیں۔ یہ جدید سائنس آج مخالفت کے اُس دور میں سے گزر رہی ہے۔ اس کا یہ دعوے کہ اس نے ایسے نسبتاً معتبر اور عام قوانین دریافت کر لئے ہیں جو کہ سماجی زندگی کی جملہ مدرکہ اشیاء کے باہمی تعلقات پر موثر حاوی ہیں، ابھی کل تک شدید مخالفت کا موضوع بنا ہوا تھا۔ ٹھیک اُسی طرح جس طرح کہ اس سے پیشتر سترھویں صدی کے طبیعات والوں کا یہ دعوے کہ وہ قوانین جو کہ مادہ کی خصلت پر قادر ہیں غیر تغیر پذیر ہیں، اور دریافت کر لئے گئے ہیں۔ طبیعات والوں کے اس دعوے نے اس سے پیشتر کے تمام نظریوں پر خصوصاً اُن نظریوں پر جو کہ دینیات کی بنیاد ڈالنے پر قائم تھے ایک کاری ضرب پہنچائی تھی اور جواب میں شدید ترین مخالفت اور غصہ کے جذبات برانگیختہ کر دیئے تھے۔ وہی دینیاتی مفکر جو کہ رفتہ رفتہ اس بات کو ماننے لگے تھے۔ کہ بے جان مادہ اپنے عام قوانین کے ماتحت باقاعدگی کے ساتھ ایک ایسے طریقے پر اپنے اوصاف کا اظہار کرتا ہے جس کا اندازہ پہلے سے لگایا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے حیاتیات والوں کے اسی قسم کے اس دعوے کی تردید اور مخالفت میں پوری شدت کے ساتھ میدان میں ڈٹ گئے تھے کہ جاندار مادہ کے متعلق بھی ایسے ہی نسبتاً معتبر اور عام قوانین دریافت کئے جا رہے ہیں جن کے مطابق ہر جاندار مادہ باقاعدگی کے ساتھ اپنے اوصاف کا اظہار کیا کرتا ہے۔ لیکن مارکسی نظریے کے اس دعوے نے کہ ایسے نسبتاً معتبر عام اور مستقل قوانین کا استخراج کرنا ممکن ہے جن کی مدد سے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں کہ انسانی سماج کس طرح وجود میں آیا۔ کس طرح اُس نے نشوونما پائی۔ کس طرح اور کیوں ارتقا کی مخصوص منزلوں کو اس نے عبور کیا۔ کن وجوہات سے کس سمت میں یہ بڑھتا ہے۔ اور کن سے کون سے وجوہات اس کو انحطاط کی طرف لے جاتے ہیں۔

مخالفین کے اندر جذبات کی جو برانگیختگی اور مخالفت کی جو شدت پیدا کی ہے۔ اُس کے مقابلے میں حیاتیات اور طبیعات کی مخالفت بالکل ہیچ معلوم ہوتی ہے۔

لیکن ابھی ان تمام مخالفتوں کے باوجود، سماجی حرکیات کی یہ خورد سال سائنس رفتہ رفتہ علمی اور عملی دنیا میں اپنے لئے جگہ بنا رہی ہے۔ ٹھیک اُسی طرح اور اُنہیں وجوہات سے جن کی بناء پر حیاتیات، طبیعات وغیرہ سائنسوں نے اپنے لئے جگہ بنائی تھی۔ نیوٹن اور اس کے ہم عصروں کے دریافت کردہ اصول، لوگوں نے دیکھا کہ نہ صرف منطقی طور پر ہی درست ہیں بلکہ ان کی مدد سے بہت سی باتوں کے متعلق صحیح صحیح پیشین گوئی بھی کی جاسکتی ہے۔ مثلاً یہ بتایا جاسکتا ہے۔ کہ سورج یا چاند گرہن کب ہونے والا ہے؟ ساتھ ہی ان اصولوں کی مدد سے بہت سے فطری امور پر قابو بھی پایا جاسکتا ہے۔ مثلاً ان اصولوں کے مطابق حساب لگا کر یہ ٹھیک ٹھیک بتایا جاسکتا ہے۔ کہ کسی خاص زاویے پر ایک خاص طاقت سے پھینکی ہوئی چیز، جیسے کرکٹ کی گیند کس خاص مقام پر گرے گی۔ اس مقام کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کرنا ان اصولوں کی مدد سے ممکن ہی نہیں بلکہ بہت آسان بھی ہے (میلوں کے فاصلے سے بلا نشانہ دیکھے آج آسانی کے ساتھ ہم ٹھیک نشانہ پر توپ کا گولا مار سکتے ہیں) ڈارون اور اس کے بعد کے حیاتیات دانوں کے دریافت کردہ قوانین کے اندر بھی اپنے موضوع کے متعلق یہی خوبی پائی گئی جس کی بناء پر اُن کے سامنے بھی مخالفین سر جھکانے کے لئے مجبور ہوئے۔ آج مارکس اور اینگلز کے دریافت کردہ سماجی حرکیات کے قوانین بھی اپنے اندر ٹھیک اسی قسم کی صلاحیتوں کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ ان قوانین کی مدد سے آج یہ ممکن ہو گیا ہے کہ سماجی واقعات کے متعلق پیشین گوئی کی جاسکے اور اسی لئے یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ موزوں حالات پیدا کر کے ان واقعات پر قابو پایا جاسکے

مارکس اور اینگلز کو نیوٹن اور ڈارون کے زمرے میں شمار کرنے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے زمانہ کی طبیعات اور حیاتیات کی طرح سماجی حرکیات کی سائنس بھی ابھی ادھوری اور نامکمل ہے۔ لیکن اس حقیقت کے اعتراف سے اس جدید سائنس کی عظمت میں شمہ برابر بھی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ اس عظمت کو سمجھنے کے لئے ہمیں کسی سائنس کے بچپن اور شباب کے درمیان مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ مقابلہ کرنا چاہئے۔ کسی سائنس کے وجود اور عدم وجود کے درمیان۔ اس میں شک نہیں کہ کائنات کے متعلق آئین سٹائین کا نظریہ نیوٹن کے کائناتی نظریے سے کہیں زیادہ تکمیل یافتہ اور بہتر ہے۔ لیکن نیوٹن نے جس عظمت کا ثبوت اپنے ان قوانین کو اُس وقت دریافت کر کے دیا تھا جب کہ اس قسم کی کسی سائنس کا وجود ہی نہ تھا۔ آئین اسٹائین کی عظمت سے جس کے سامنے کہ نیوٹن کے قوانین موجود تھے۔ کہیں زیادہ برتر اور رفیع الشان ہے۔ سماجی حرکیات کی سائنس جوں جوں بڑھتی اور ترقی کرتی جائے گی۔ یہ زیادہ سے زیادہ مکمل اور ہمہ گیر ہوتی جائے گی۔ جیسی کہ فی الحقیقت یہ آج ہوتی جارہی ہے اور اپنے موضوع کے تمام مظاہرات کی گتھیوں کو سلجھا سکے گی۔

لیکن اپنی اس ترقی کے باوجود اس سائنس کے بنیادی اصول انہی بنیادی قوانین کے سہارے بیل چڑھیں گے جو کہ اس کے رفیع الدرجات ہادیوں نے اس کے ابتدائی محققوں نے دریافت کئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سائنس اپنی نشوونما اور ترقی کے ساتھ اپنے بنیادی نظریوں کو بھی ارتقاء کی طرف لے جائے گی لیکن اس عمارت کی بنیادیں بہرحال وہی بنیادیں رہیں گی جن کو مارکس اور اینگلز کی غیر معمولی کاوشوں نے تیار کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ دور حاضرہ کی حیاتیات ڈارون کے نظریوں کی بنیاد پر قائم ہے۔

مارکس اور اینگلز کی تعلیمات کے متعلق جو دعوے یہاں پیش کیا جارہا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے عمرانیات کی کسی سائنس کو مکمل کیا ہے۔ جو دعوے یہاں پیش کیا جارہا ہے وہ اس دعوے کی نسبت کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اس سائنس کو مرتب کرنے کی پیش قدمی کر کے وہ معرکۃ الآراء اور انتہائی دشوار کام کیا ہے جس کے لئے ایک غیر معمولی ذہانت درکار ہوا کرتی ہے۔ اور جس کے بغیر کوئی بھی علم صحیح علم کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ ان ہردو مفکروں اور باعمل عالموں نے تاریخ میں پہلی بار سماجی زندگی کے متعلق تحقیق اور تدقیق کے سلسلے میں سائنس کا بنیادی اسلوب استعمال

کیا ہے۔

سائنس کا بنیادی اسلوب کیا ہے۔

سائنس کا بنیادی اسلوب پروفیسر ہالڈین کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس کائنات میں ہر سالمہ (WOLECULE) خواہ وہ کیسا ہی اور کسی بھی شکل کا کیوں نہ ہو، اپنی بساط سے زیادہ قوت (انرجی) پاکر تغیر پذیر اور بے توازن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حرارت جو کہ سالماتی حرکت (Molcular. Mosion) کی تیزی کا ہی دوسرا نام ہے۔ تقریباً تمام کیمیائی تبدیلیوں کی رفتار کو تیز کر ڈالتی ہے غرضیکہ ہر وہ سالمہ جس کے اندر اُس کے مخصوص حد تغیر سے زیادہ انرجی (قوت) پیدا ہو جائے یا سالموں کا ہر وہ جوڑا جو ایک مخصوص قوت کی نسبت زیادہ زور سے آپس میں ٹکرائے لامحالہ طور پر اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کر لیتا ہے۔ یہ زاید انرجی جو کہ تبدیلیاں پیدا کیا کرتی ہے۔ کبھی حرارت سے پیدا ہوتی ہے کبھی روشنی سے اور کبھی دوسرے سالمے کی حرکت سے۔ طیف پیمائی (Specfror copy) کے ذریعے جس سے کہ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ سالمے کس طرح ہر قدم پر انرجی حاصل کرتے ہیں اور پھر رہا کرتے ہیں۔ ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کسی سالمے کے اندر کیا کیا کیمیائی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور ان تبدیلیوں کی رفتار کیا ہے۔

تبدیلیوں کا یہ اصول ہر جگہ کارفرما ہے مشین کا دھرا جب رفتار کی ایک خاص حد پر پہنچ جاتا ہے تو اُس کے بعد وہ اپنے محور کے گرد یکسانی سے نہیں گھومتا بلکہ بے توازن ہو کر باہر کی طرف کو جھکنے لگتا ہے ہمارا سماج بھی اسی قسم کے وجوہات سے بے توازن بنا ہوا ہے۔ ہمارے سماج کی پیداواری طاقتیں چونکہ ہمارے سماج کے پیداواری تعلقات کی بساط سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔ اسی لئے آج یہ بحرانوں کے چکر میں پھنسا ہوا ہے۔

ٹھیک اسی طرح جب ٹی۔این۔ٹی نامی مادہ آتش گیر کے ایک سالمہ میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی انرجی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے جوہر (OTOMS) اپنی مخصوص ترتیبی ساخت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ لیکن انہی جوہروں کی ترتیب کو اگر بدل دیا جائے تو یہ نہ صرف ٹی۔این۔ٹی کے گرم سالمے کی ہی انرجی کو اپنے اندر سنبھال سکتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ انرجی کے حامل ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ نائیٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے جوہر۔ لیکن جوہروں کی وہ ترتیب جو کہ ٹی۔این۔ٹی کے سالمے کو مرتب کرتی ہے۔ اس بڑھی ہوئی انرجی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ چنانچہ حرارت پاتے ہی وہ دھماکا اور بڑے زور کے ساتھ خود کو تبدیل کر لیتی ہے اس کی تبدیلی کا یہی عمل دھماکے سے پھٹنے کا عمل ہوتا ہے۔

تمام نیچر چونکہ ایک ہے۔ اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے سائنس کا اسلوب بھی ایک ہی ہے۔ اب اس اسلوب کو خواہ چٹانوں کو سمجھنے کے لئے استعمال کیا جائے خواہ پھولوں کو خواہ جراثیم کی دنیا پر اس کو استعمال کیا جائے۔ اور خواہ بینکروں اور مل کے مالکوں کی دنیا پر۔

مارکس اور اینگلز کی عظمت دوام اسی راز میں مضمر ہے کہ انہوں نے سائنس کے اس بنیادی اسلوب کو انسانی سماج پر بھی اسی طرح منطبق کیا اسی طرح کہ اس سے پیشتر یہ جمادات، نباتات، اور کائنات کے دیگر عناصر پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے منتشر تاریخی واقعات، اقتصادی مواد اور فلسفیانہ نظریوں کو جو کہ تاریخ کے دامن میں صدہا سال سے جمع ہوتے جا رہے تھے ٹھیک طرح مرتب کیا۔ تولا، نتیجے قائم کئے اور ان کے باہمی تعلقات کے اُن عام قوانین کو دریافت کیا جو کہ ان سب کے اندر مستتر طور پر داخلی خصوصیت کی شکل میں موجود ہیں۔ ان ہر دو مفکروں کی دوربیں اور جوہر بیں نگاہوں نے سماجی زندگی کے مظاہرات میں وہ باہمی تعلق دریافت کیا جس کے بغیر یہ سماجی زندگی ایک الجھا ہوا معمہ بنی ہوئی تھی۔ اور جب ایک بار یہ تصدیق ہو گئی کہ ایک قسم کی مدرکہ شے لامحالہ طور پر دوسری قسم کی مدرکہ شے سے وابستہ ہوتی ہے اور ان دونوں کے درمیان علتی (CANSAL) کڑیاں یعنی ایسی کڑیاں جو کسی معلول کی علت ہوں ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں۔ تو پھر یہ مشکل نہ رہا کہ تاریخی اور عمرانی رجحانات کے متعلق ان کے نتیجوں کی اور ان کے مستقبل کی پیشگوئی کی جا سکے۔ بشرطیکہ ان رجحانات میں کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہ ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہو گیا کہ ان رجحانات کے اندر مناسب دخل اندازی کر کے سالمے کے جوہروں کی ترتیب کی طرح ان کی علتوں کو بدل کر — ان سے موزوں اور حسب منشا نتائج حاصل کئے جا سکیں۔

فکر تونسوی

خلوص

برق لہرائی ـــــ اندھیرے کی عبا کانپ گئی، تھرائی
سسکیاں بند ہوئیں ـــــ اُٹھیں نگوں سر نظریں،
مرے تاریک در و بام کے لب ہائے غنودہ کے قریں،
نور آلودہ تبسم کی کرن تھرکی، تھرک کر ناچی ـــــ
اور میں گوشۂ ظلمت سے نکل کر جو چلا ـــــ کھو گیا اُجیالے میں ـــــ
مرے دمساز! میں تیرے لئے تا دیر رہا غم بکنار ـــــ!

میں کہ تا دیر رہا خوگر ظلمات مہیب،
اور کچھ دیر ابھی کھاتا اُجالوں کے طربناک فریب
اور کچھ دیر ترستے ہوئے ہونٹوں کو بھگوئے رکھتا
برق تابندہ، مگر ایک نفس کی تھی اسیر
برق یک لمحہ ـــــ اندھیرے کے لئے ایک عبائے سیمیں ـ
ـــــ اور عبا چاک ہوئی، اُس کو پھٹنا تھا، مرا ساتھ کہاں تک دیتی؟
(وہ تو پل بھر کے لئے ظلمت بیزار نے کروٹ لی تھی)
ـــــ اور میں تھامے ہوئے چاک گریباں اپنا
پھر اُنہی تیرہ خلاؤں میں گھرا ـــــ سوچ رہا تھا ہمدم!
ـــــ ابھی اک برق سی جو میرے در و بام پہ لہرائی تھی ـ
مری اپنی ہی نگاہیں تو فسوں کار نہ تھیں ـــــ!؟

ابوالفضل صدیقی

ٹی بی

یوں تو بیماری بھر روزانہ ہر صبح آفتاب حشر طلوع ہونے کا سماں رہا مگر ان دنوں کی ایک ایک گھڑی کچھ عجیب ہنگامہ بردوش تھی جن میں ہم سناٹوریم انچارج کو مشورے کیلئے بلانے گئے اور خصوصاً ان دو دنوں میں تو واقعی ہمیں عذاب قبر کا مزہ آ گیا ہے۔ جن میں ہم بھائیصاحب کو سنوٹوریم میں داخل کرانے گئے۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ اب تو سب کچھ بھولا ہوا فسانہ اور خواب پریشان سا ہے۔ آج نہ وہ ماحول ہے نہ وہ واقعات مگر سال بھر کی بات کل سی معلوم ہوتی ہے۔ جواں مرگ بھائیصاحب بیچارے کی موت کے لگائے ہوئے زخم پر وقت کا سریع الاثر مرہم قریب قریب تمامتر اندمالی کیفیات پیدا کر چکا ہے۔ مگر ان کی تیمارداری کے سلسلے میں پہاڑ کے اول و آخر سفر کے واقعات کچھ رنج کے علاوہ خوف کے ایسے گہرے نقوش چھوڑ گئے۔ جو ذہن سے تازیست فراموش نہیں ہو سکتے۔ جب مقامی ڈاکٹر و حکیم صاحبان ہلکی حرارت اور خشک کھانسی کے وجوہات معلوم کرنے سے قاصر رہے تو ہم کو اور ہمارے خالہ زاد بھائی نہال میاں کو گھر والوں نے بھائیصاحب کے بعض غیر معمولی دوستوں کی بلند پروازی کے مطابق سناٹوریم انچارج کو بلانے پہاڑ بھیجا یوں تو تمام علامات ٹی بی کی موجود تھیں۔ مگر کوئی مقامی ڈاکٹر سینے میں کوئی کھلی نشانی نہ پا سکا تھا۔ لہٰذا بالاتفاق رائے سناٹوریم انچارج کو دکھا کر صحیح تشخیص اور مناسب علاج تجویز کرانا بھائیصاحب کے عزیز و احباء کی میٹنگ میں پاس ہو گیا اور جس وقت ہمیں تایا صاحب قبلہ نے حکم سنایا تو میں اچھل سا پڑا یوں تو کوئی لمبا سفر نہ تھا۔ ستر اسی میل ریل پر اور پھر تیس میل موٹر پر سب ملا کر گھر سے سناٹوریم آٹھ دس گھنٹہ کا راستہ اور آٹھ سات ہزار فیٹ کی بلندی پر واقع تھا مگر میں اچھل یوں پڑا کہ جب تین چار مرتبہ اسکول لائف میں گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے کے بعد ہم اسکاؤٹ کیمپ کی آوارہ گردی المعروف بہ ہائیکنگ Hikeing کے سلسلے میں ویران متروک سڑکوں اور راہ چہیر پہاڑی مقامات کا دورہ کرتے اور لکڑی کے ڈاک بنگلوں میں کاٹھ کے اُلو خانساماں اور چٹانوں سے مستم تراشے ہوئے چوکیدار ہوتے ہیں ٹھہرتے ٹھہراتے اُس مقام سے گذرتے تو بس سمجھ لیجئے کہ ایک سانس میں گذرتے ہی چلے گئے۔ بڑی وحشت کے ساتھ اس ٹی بی کے وطن کو دیکھتے۔ تیز تیز اپنی منزل مقصود کی جانب لو لگائے جو وہاں سے آٹھ نو میل کے فاصلے پر ایک پرفضا پہاڑی مقام ہے۔ قصبہ کی آبادی پار کرتے اور جس وقت ہم خاص سناٹوریم کی حدود میں سے گذرتے تو میری تو خیر یہ ہے معاذ اللہ ہسپتال کے ماحول سے یوں بھی وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر بالخصوص جس وقت ہم اس خاص ہسپتال کے ماحول میں خود کو پاتے اور سڑک کے کنارے اور پہاڑی اور گھاٹی کے ڈھالوں پر چھوٹی اور بڑی حیثیت اور درجہ کی اونچے دروازہ والی کھلی ہوئی وارڈوں میں ہسپتال کی عمارت کا آہنی سیاہ وارنش والی مسہریوں پر سوکھے پیلے مٹیالے اور کہیں کہیں پر کوئی محمد اسمٰعیل کی چوتھی کتاب والی انسانی ڈھانچے کی تصویر مریض آرام کرتے ہوئے نہیں بلکہ آرام کرائے جاتے ہوئے دکھائی دیتے تو ہم غیر ارادی طور پر بغیر قدم ملائے ایک نفسا نفسی کے عالم میں کوئیک مارچ کرنے لگتے اور ہمارے ماسٹر صاحب بیچارے پیچھے رہ جاتے ہمیشہ ماسٹر صاحب نے قصبہ میں گذرتے وقت یہ بتلایا کہ یہ قصبہ ٹی بی کے طفیل اور دم قدم کا زائیدہ ہے یہاں کے جملہ ساکنان دکاندار، نائی قصائی، بڑھئی لوہار، خوانچہ والے، اور حتیٰ کہ مسجد کے پیش امام خود یا ان کے پدر بزرگوار یا جد امجد پہلی مرتبہ ٹی بی میں گرفتار ہو کر یہاں آئے اور جس طرح ٹی بی ان کو نسلاً بعد نسلاً ورثے میں ملی اسی طرح یہاں کی سکونت بھی اور بندہ خدا نے ہر مرتبہ سناٹوریم کمپاؤنڈ سے گذرتے وقت یہ حکایت چڑھائی پر چڑھتے ہوئے بیان کی کہ اس ہسپتال میں ڈاکٹروں اور کمپونڈروں سے لیکر بھنگیوں اور چوکیداروں تک سب کے سب پہلے پہل مریض ہو کر آتے ہیں اور پھر شفا پاکر

کوشش کرکے گورنمنٹ سے اپنا تقرر اسی ہسپتال میں کرا لیتے ہیں اور ہم خرما وہم ثواب مرض کا عملی تجربہ حاصل کرکے تازیست خود اپنے اور ہسپتال کے مریضوں کے علاج میں لگے رہتے ہیں۔ اس مفلس زندگی کا تو خیر موازنہ ہی کیا۔ جب ہم تھرڈ کلاس میں ریل کا سفر ختم کرنے کے بعد پہاڑ کا سفر منزل بہ منزل جوتے کی سواری پر طے کیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ ہم دونوں وہاں جانے کے ارادے سے خاص اہمیت کے ساتھ روانہ ہوئے اور رات کو ۱۲ بجے کی ٹرین سے چل کر قریب ۸-۹ بجے صبح کے سناٹوریم میں جا دھمکے ڈاکٹر صاحب ہم اجنبی پردیسیوں سے غیر معمولی اخلاق کے ساتھ پیش آئے مجھے تو انہوں نے غالباً پہلی ہی نظر میں دیکھتے ہی سلام علیک کے بعد سمجھ لیا ہوگا۔ کہ دو من پانسیر وزن کے سُرخ و سفید سنگین قسم کے انسانوں کے پاس ٹی بی مرنے نہیں آیا کرتی مگر نہال میاں کے نوجوان ہرن کے سے تیور اور دم خم کا اندازہ کرنے میں غالباً انہیں دو منٹ لگے۔ اور انہوں نے یہ اندازہ کرکے کہ ان دونوں میں ابھی کوئی دق کے پہلے درجہ کی ابتدائی مراحل میں بھی نہیں ہے۔ میری جانب متفرانہ نظروں سے دیکھا " آیئے۔ ارشاد " میں نے کہا جناب کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ تین روز کیلئے بدایوں تشریف لیجا سکیں گے آپ؟ مجھے اپنے بھائی صاحب قبلہ کو دکھانا ہے ڈاکٹر صاحب نے بہت تفصیل کے ساتھ کل حالت دریافت کی اور پھر تھوڑی دیر "نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز" والی اور کچھ مشرقی عدیم الفرصتی اور معذوریوں کا اظہار کیا اور چند خوشامدانہ سریلے الفاظ سُننے کے بعد اُنہوں نے کچھ آمادگی ظاہر کی۔ خصوصاً جب میں نے اُن سے یہ کہا میں محض ایک کسان ہوں تو انہوں نے جو مغالطہ اپنے دماغ میں میرے سرکاری اہلکار ہونے کا قائم کر لیا تھا۔ وہ دور ہو گیا اور وہ تجارتی گفتگو کرنے میں زیادہ آزاد ہو گئے " اوہو " ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کسان! اور پھر میرے وبیز و کوناسرج کے نیلے سوٹ پر از سرتاپا نظر ڈال کر فرمایا " خوب " ارے صاحب توبہ کیجئے آپ ہیں وہاں کے بڑے زمیندار صاحب۔ بلکہ جاگیردار کہئے یہ کسان والی ایک ہی رہی۔ ہا ہا ہا ہا پورا مُنہ پھیلا کر ایک قہقہہ لگایا۔ اور ذرا بے تکلفی کے انداز سے انگوٹھا ہتھیلی پر رکھ کر چاروں انگلیاں ملا کر از سرتاپا اشارہ کیا۔ بس ہمارے ملک کی آزادی کا وہی دن ہوا جس روز ہمارا کسان یہ کپڑے پہن کر ڈاکٹر کے پاس جائے گا۔ اس وقت تو آپ پبلک سروس کمیشن کے ممبر معلوم ہوتے ہیں۔ نہال میاں نے بغیر اس کا لحاظ کئے کہ ڈاکٹر صاحب سے چند منٹ کی ہی ملاقات ہے۔ انہیں ہم مذاق پا کر کہا۔ " ڈاکٹر صاحب پبلک سروس کمیشن ممبروں کے دھوبی اور درزی کرایہ پر بھی تو ——— "

" ہو ——— ہو ——— ہو " کرکے بڑے زور سے قہقہہ مارا اور پھر ذرا سنجیدہ ہو کر ڈاکٹر صاحب نے کہا " خیر کسان کے کپڑے تو نہیں۔ البتہ پبلک سروس کمیشن کے ممبروں کے سوٹ کسان سے ضرور مستعار ہوتے ہیں "۔

تقریباً نصف گھنٹہ کی دلچسپ و پُرلطف تجارتی گفتگو کے بعد ہم دو سو پچاس روپے یومیہ اور ڈبل فرسٹ کے نتیجے پر پہنچے۔ میں نے ڈھائی سو روپیہ نقد ایڈوانس پیش کیا۔ چونکہ دورانِ گفتگو میں مجھے اُن کے مُنہ سے کچھ اس قسم کی تجویز مترشح ہوتی معلوم ہوتی تھی۔ کہ وہ کم از کم ایک دن کی فیس پیشگی چاہتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا " اوہو " بھلا اس کی کیا ضرورت تھی؟! " خیر " ہاں صاحب خوب یاد آیا ——— وہ تو میں نے سوٹ ہی کو کہا تھا۔ ارے صاحب ایک سوٹ ہی کیا اللہ تعالےٰ ہندوستان میں بقائے حیات کی ہر شئے کیلئے کسان ہی کے آگے ہاتھ پھیلواتا ہے ——— لہٰذا بغیر اس کے مفر بھی تو نہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ یہ روپیہ مجھے یوں نقد نہ دیں۔ بلکہ ان کی جگہ میرے لئے وہاں پہنچتے ہی خالص گھی خرید فرمالیں اور ہاں آپ کے یہاں تو ذاتی بھینسوں اور گایوں کا وہی بہتیرا ہوتا ہوگا۔ اور وہ چیز نہایت قابلِ اعتبار رہے گی۔ اور یہ کہتے ہوئے چٹکی میں مضبوط دبی ہوئی نوٹوں کی گڈی میری جانب واپس کرنے کے لئے بڑھائی۔ میں نے بات کو کم اہم کرنے کے لئے بے پروائی کی صورت بنا کر کہا ——— وہ ہو جائے گا انتظام کوئی بات نہیں " نہیں صاحب میں نے اس لئے کہا تھا کہ آپ قیمت لیتے جایئے تاکہ ہم آزادی کے ساتھ آئندہ کو تعلقات قائم رکھ سکیں یہاں اس اُوجڑ پہاڑ میں تو بڑی دقت ہے اب لیجئے ایک پریشانی ہو تو بیان کی جائے ہمشیر زادیاں آئی ہوئی ہیں۔ دو تین مہینہ ٹھہریں گی۔ ان کے والد سرکار دکن میں محکمہ جنگلات کے افسر ہیں۔ ان بچیوں کی ساری عمر جنگل اور دیہاتی مقامات میں کٹی ہے۔ بیچاریاں یہاں سخت

وقت ہر بات کی محسوس کرتی ہیں ایک ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ مشین کا پسا ہؤا آٹا نہیں کھا سکتیں کہتی ہیں ہضم ہی نہیں ہوتا ؛ مخصوص انداز سے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا - اور چند سیکنڈ توقف کر کے غالباً میرے بشرے کو پڑھا ——

میں نے کہا" ڈاکٹر صاحب ذرا سنیئے اس چیز کے لئے میں روپیہ لے بھی جاتا جو خریدنا ہوتی اور جو چیز گھر میں موجود ہے اس کے لئے بھلا دام کاہے کو لے جاؤں" اور جس وقت ہم لوگ رخصت کی اجازت چاہ رہے تھے اس وقت برابر کے دروازہ سے ملازم لڑکے نے آ کر کہا " اور سرکار بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ رمضان آ رہے ہیں، اور بیسن تو بیاڑ پر ہوتا ہی نہیں ہے" میں نے یہ اندازہ کیا کہ دفتر کی گفتگو بالتفصیل بیگم صاحبہ پس پردہ ملکۂ نورجہاں کی طرح برابر کمرہ میں بیٹھی سنتی رہا کرتی ہیں۔ موقع پر ڈاکٹر صاحب کی مدد و معاون رہتی ہیں — میں "بہت اچھا" " بہت اچھا" کہہ کر چل پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے روز شام کی گاڑی سے روانگی کا وقت تعین کیا تھا اور رات کے ۱۲ بجے ہمارے یہاں پہنچنے کا - لہذا یہاں ٹھیرنا اور پھر ڈاکٹر کو ساتھ لے جانا ہمارے لئے بہت زیادہ تھا —— پھر ڈاکٹر صاحب کی آمد کا سامان - اطلاع تو خیر بذریعہ تار دی جا سکتی تھی۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب ہی کا بنگلہ بھرئے سناٹوریم میں ایسی جگہ پر واقع تھا جہاں ٹی بی کے ہسپتال کا ماحول محسوس ہوتا تھا اور اگر ٹھیرنا پڑتا تو ہمارے لئے یہی مناسب قیام گاہ تھی — پھر بھی گھر پہنچنا ہر صورت سے مستحسن خیال کیا اور ہم رخصت ہو گئے —— وقت معینہ پر ہم مع چند مخصوص دوستوں کے ڈاکٹر صاحب کو لینے اسٹیشن پہنچے ریل سے اترتے ہی ڈاکٹر صاحب کے چپراسی نے مٹی کے تیل کا گول جستی رنگ کا ڈرم خاص میری جانب کو بڑھا کر پیش کیا - جس کو دیکھ کر میں کچھ نہ سمجھا اور ڈاکٹر صاحب کو متوجہ دیکھ کر متعجب ہؤا اور متنفرانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا "کیوں کیا بھول گئے ؟ گھی ارے صاحب گھی" ڈاکٹر صاحب نے میرے کان کے قریب منہ لا کر سرگوشیوں میں کہا۔ —— میں نے اپنے خدمت گار کو ڈرم لینے کا اشارہ کیا - یوں تو ان کا سب ہی اسباب چپراسی سے مع اس ڈرم کے میرے خدمت گار کے

چارج میں پہنچا مگر اس گھی کے برتن کی قطر اور عمق کا خاص طور سے میں نے اندازہ لگایا اور تین مرتبہ اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا - اور ڈاکٹر صاحب کے ملازم کی اس عجیب و غریب موقع اور وقت پر پیش کرنے کی حرکت پر یک گونہ متعجب ہؤا مگر فوراً ہی ڈاکٹر صاحب کے انداز سے سمجھ لیا کہ وہ ہدایت کے مطابق کر رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مہمانداری اور میزبانی کی واقعی مشرقی حدود اور دیہاتی خلوص سے بالا تر ادا کرنے کی وجوہات کچھ خالص مہمانداری اور میزبانی کے فرائض ہی پر مبنی نہیں تھیں بلکہ میں جانتا تھا کہ دوران قیام میں مہینے میں دو مرتبہ بھائی صاحب کی خدمت میں بسلسلہ مزاج پرسی دو تین روز کیلئے سناٹوریم جانا پڑیگا - اور بھائی صاحب کم و بیش تین ماہ قیام کریں گے —— اور یہ بھی مجھے اچھی طرح معلوم تھا - کہ ہسپتال کے ماحول سے میں کسقدر گھبراتا ہوں - قصبہ کا تو سوال ہی بیکار تھا. وہاں تو قیام کی کوئی مناسب جگہ ہو ہی نہ سکتی تھی - سناٹوریم کمپاؤنڈ میں سوائے ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کے اور کونسی جگہ میرے ٹھیرنے کی ہو سکتی ہے - میں تو اسی دور اندیشی کی وجہ سے ہمہ تن تواضع بن کر ڈاکٹر صاحب کو میزبانی اور مہمانداری کے آداب سکھانے میں مشغول ہو گیا - اور میری سرگرمیاں ملا کر سب اہل خاندان میرے اور بھائی صاحب کے مخصوص دوست اور دیگر اہل غرض شہر والے جو اپنی اغراض کی بنا پر نوازنا چاہتے تھے - میری ہی آڑ لیکر مصروف تھے. غرض تین دن کے قیام میں ڈاکٹر صاحب خاص میرے غریب خانہ پر تو صرف دو ہی وقت نان و نمک عرف روکھی سوکھی المعروف بہ قورمہ شیرمال بریانی متزعفر کباب فرنی اور کوفتہ وغیرہ وغیرہ نوش جان فرما سکے بقیہ کھانے کے چار اوقات کچھ میرے کچھ بھائی صاحب کے مخصوص دوستوں نے گھیر لئے تھے اور جو چاء کے وقت بھی تقسیم ہو گئے تھے اور سنہرے کارڈوں پر عصرانوں اور کھانوں کے دعوت ناموں کی تقسیم کا اثر ہمارے چھوٹے سے شہر کی قصباتی قسم کی پبلک میں یہ ہؤا کہ جیسے ڈاکٹر صاحب کے اشتہار تقسیم ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب باولے گاؤں اونٹ بن گئے. اور مریدوں نے ان کی قوت پرواز میں وہ روح پھونکی کہ تمام شہر کے ٹی بی کے مریضوں میں یہ عقیدہ سا پھیل گیا کہ بس جیسے ہی لال لال نلیوں والا آلہ ایک کے سینہ اور ڈاکٹر صاحب کے کانوں میں لگ کر مریضوں کے سینہ پر گھوم گیا اور جانو سلب مرض ہو گیا — تین دن گرما گرم دعوتوں اور عصرانوں

کے ساتھ ساتھ صبح و شام دوپہر بلا امتیاز وقت مطب بھی گرم رہا۔ اور سال دو سال چار سال جینے والے دق کے مریضوں سے لیکر ایک دن دو دن چار دن...... تک کی زندگی بقایا رکھنے والے سب ہی مریض چھوٹے بڑے ہر فرقے کے ڈاکٹر صاحب کو دکھانے آئے۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے کو تو عذر ہی نہ ہو سکتا تھا۔ مگر میں نے سناٹوریم کی شہرت کی اہمیت کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی فیس سولہ اور بتیس روپیہ قائم کر کے چلتے وقت علاوہ اپنی طے شدہ فیس کے ایک معتد بہ رقم حساب سمجھا کر یہاں کی سہ روزہ مطب کی آمدنی کی پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب ہفتہ بھر کے اندر اندر ہسپتال میں وارڈ کا انتظام کر کے بلا لینے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گئے۔ اور ہم لوگ بھائی صاحب کے لے جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ ان تیاریوں میں ڈاکٹر صاحب کی فرمائشیں نمایاں تھیں۔ جب اس سلسلے میں والد صاحب قبلہ کی نظر ڈاکٹر صاحب کے گھی کے برتن پر پڑی تو انہوں نے ظریفانہ سنجیدگی سے کہا "اوہو۔ بس۔ یہ صرف اتنا سا برتن!؟ ——— ہمارے ڈاکٹر صاحب لیکر چلے تھے گھی کا۔ چھوٹے بھائی نے کہا۔

"جی ہاں یہی تو میں کہتا ہوں گھی کیلئے اور یہ ذرا سا برتن۔ اور پہلی ہی مرتبہ ہا ہا ہا۔ ابھی تو وقتی دور ہے۔ جی صرف ڈھائی کنستر ہی تو مٹی کے تیل کا اس میں کارخانہ سے آتا ہے ——— "ہمشیر زادے نے کہا ——— معلوم ہوتا ہے لڑکی کی شادی کر رہے ہیں منجھلے بھائی نے کہا" جی یہ تو مصالحہ کے خرچ کیلئے ہے اگر کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو ڈاکٹر صاحب چھکڑا ہی بھیجتے۔ گھی کے لئے ——— ہو ہو ہو ایک قہقہہ پڑا ———

ہاں اور دوسری فرمائشوں کے برتن اور وزن کا معیار ڈاکٹر صاحب کا لایا ہوا یہ گھی کا برتن ہے بس اسی کی جسامت کے انداز سے ہر ایک کا اندازہ ہو سکتا ہے ——— اس میں ذریعہ من گھی آ جائیگا۔ اور اگر ہمیں زمیندار جاگیر دار بنا دیتے تو نہ معلوم کیا لیکر آتے ——— جب کسان نے بتایا تو یہ ڈرم آیا ——— وہاں معلوم ہوتا ہے سناٹوریم کمپاؤنڈ میں کوئی کرانہ اور جنس وغیرہ کی دکان بھی تو نہیں ہے شاید ڈاکٹر صاحب وہاں مریضوں کے آرام کی وجہ سے دوکان کھول رہے ہیں۔ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا ———

تایا صاحب قبلہ جو ابتک مصلے پر تسبیح پڑھ رہے تھے اور وظیفہ کے دوران میں بولنے سے معذور تھے وظیفہ ختم کرتے ہی گویا برس پڑے "لاحول ولاقوۃ توبہ توبہ کسی بنیئے بقال کے گھر میں پیدا ہوئے ہوتے تم ضرور باپ دادا کے نام کو بٹہ لگاؤ گے۔ شرم نہیں آتی ایسی اوچھی اور کم ظرفی کی باتیں کرتے ہو سب، ارے تم کیا جانو انگریزی پڑھے کہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی نازبرداریاں کیا ہوتی ہیں، صاحب لوگ سوکھی فیسوں میں ہی علاج نہیں ہوا کرتے اور پھر کوئی بات بھی تو ہو میاں یہ تو گھر کی کھیتی ہے بہت سستے چھوٹے آپ ان داموں میں ورنہ ان کے منہ سے جو کچھ بھی نکل جاتا پورا کرنا پڑتا۔ یہ تو جو کچھ ان غریب نے مانگا ہے گھر میں سے نکالو اور دے جاؤ ——— واقعی انگریزی پڑھ کر ظرف بہت تنگ ہو جاتا ہے ——— ہے نابنیئے کا علم" ——— میں تایا صاحب کی گفتگو سے مطمئن اور خوش ہوا ——— میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہاں لانے کی لمبی چوڑی مہمانداری اور دعوتوں کی اور پھر فیس معقول رقم کی آمدنی کی ساری کی ساری سرخرویت تنہا مجھ ہی کو حاصل ہے اور پھر جو کچھ بھی سامان تحفتہً جائیگا تنہا میری ہی جانب سے جائیگا اور پھر اس میں میرے اپنے آئندہ کے قیام کے آرام کی ساری حکمتیں پوشیدہ ہیں ہم یہ سارا پروپیگنڈا اور سامان جو ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی میں قیام کیلئے ایک کمرہ حاصل کرنے کی غرض سے، اور تایا صاحب اپنی مشرقی زمیندارانہ اور خصائل کے تحت کر رہے تھے۔ لہٰذا تین ہی دن کے قیام میں میں نے اپنی غرض کے تحت اپنے مکان پر ڈاکٹر صاحب کو مہمانداری کے جملہ آداب عملی طور پر سکھا دیئے تھے۔ اور پھر فرمائشوں میں نہایت عجیب و غریب ترمیمیں جن کو محض نہال میاں سمجھ رہے تھے کہ یہ مناسب جائے قیام اور گرما گرم مہمان نوازی کرانے کیلئے ہو رہا ہے ——— ڈاکٹر صاحب کا تار آیا ۲۵ کا ٹچ بورڈ بیس وارڈ ہمارے لئے منتخب ہو گیا۔ ہم تیار تو پہلے ہی سے تھے۔ بھائی صاحب کو لیکر چل پڑے۔ پہاڑی ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے سے پیشتر اوپر چڑھنے کے لئے ایک لاری اور کار کا بندوبست بذریعہ ٹیلیفون ہم سے پہلے راستہ ہی میں طے کر چکے تھے۔ جو ہماری منتظر تھیں۔ میں نے نہال میاں کو بھائی صاحب کے ساتھ کار میں چھوڑ دیا۔ اور خود لاری میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ کیونکہ پیچ در پیچ پہاڑی سڑک پر بھائی صاحب کو چکر آ رہا تھا اور کار دس میل فی گھنٹہ

کی رفتار سے چلنے پر مجبور تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب والا کل سامان لاری کی چھت پر لگوا دیا تھا اور خود ڈرائیور کی سیٹ کے برابر بیٹھا تھا اور خانساماں اور خدمتگار پیچھے لاری کے اندر ہمارے اسباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ایک ملازم اور نہال میاں کار پر بھائی صاحب کے ساتھ تھے۔ میں بجائے اس کے کہ لاری مٹ ۲۵ کاٹج بورڈ یس وارڈ کو لے جاتا سیدھا ڈاکٹر صاحب کے بنگلہ لدا کر لے گیا۔ سورج غروب ہونے میں پون گھنٹہ باقی تھا اپنے بنگلہ کے قریب خلاف معمول چڑھائی پر چڑھتی ہوئی لاری کی آواز سن کر غالباً ڈاکٹر صاحب باہر نکل آئے تھے اور ہمیں برآمدے میں کھڑے ملے۔ لاری پورٹیکو میں جا کر ٹھہری۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت تپاک سے ہاتھ ملایا۔ میرے اور ان کے ملازموں نے مل کر ان کا مخصوص سامان لاری کی چھت پر سے اُتارنا شروع کیا۔ گھی کا ڈرم اور آٹے کی دو ملوں بوریوں کے بعد جب دال کے کٹے پیڑوں۔ انڈوں۔ مرغیوں اور آموں اور ترکاریوں کی چھوٹی بڑی ٹوکریاں اُترنا شروع ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب ایک متعجبانہ مسکراہٹ کے ساتھ "خوب یہ کیا"! چوزے! —— اوہو انڈے! آم!! پیڑے!! ٹماٹر ہر کنڈی اُترنے کے ساتھ اس کے اندر بھری ہوئی جنس کا نام آہستہ سے ادا کر کے شکریہ کا انداز بناتے رہے۔ اور خود بغور ہر چیز کو اشتیاق کے ساتھ دیکھتے رہے۔ نصف گھنٹہ سامان اُتارنے میں صرف ہوا اتنے میں نہال میاں بھائی صاحب کو کاٹج پہنچا کر آ پہنچے اور لاری بھیجنے کی جلد ہدایت کی، ہمارے بستر لاری کے اندر تھے اور میں تھوڑی دیر ڈاکٹر صاحب کے حکم کا انتظار کرتا رہا۔ اور جب غور کیا کہ یہ اِدھر متوجہ نہیں ہیں۔ تو "دیکھو خانساماں جی۔ یہ ہم دونوں کے ہولڈال ہیں۔ تم یہ وہاں وارڈوں میں نہیں کھول سکتے کیونکہ ہمیں وہاں ٹھہرنے کا حکم نہیں ہے لہذا یہ تم ابھی ایسے بندھے بندھے رہنے دو —— سمجھ گئے نا؟" —— مگر میرے مخاطب صحیح شامہ نوازی کرتے ہوئے پیڑوں اور آموں کی کنڈیوں کی جانب اسقدر منہمک تھے۔ کہ وہ کچھ بھی نہ سُن سکے اور ایک چونسے کا نیم پختہ دانا اُٹھا کر بولے "ایں یہ کیا آم ہے؟ چونسہ؟!" میں نے کہا جی چونسہ —— ثمر بہشت چونسہ۔ —— "ایں چونسہ اتنا بڑا بھی ہوتا ہے" ڈاکٹر صاحب نے متعجبانہ کہا؟ میں نے کہا "اتنا بڑا چونسہ آپ کو اودھ میں بھی مشکل سے نظر پڑا ہوگا۔

شاید مرشد آباد میں بھی چونسہ آج تک اتنا موٹا نہ پھلا ہو۔ مگر یہ میرے باغ میں چونسہ فجری کے سائز پر پہنچ جاتا ہے" "خوب" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر دفتر کے اندر لے گئے اور لاری ہمارے ملازمین کے وارڈ کی جانب روانہ ہو گئی —— غالباً ڈاکٹر صاحب سہ پہر کے راؤنڈ سے واپس آ کر وزنی ناشتہ کے ساتھ چار پی چکے تھے۔ کیونکہ انہوں نے مذہبی۔ طبی۔ اور سیاسی بحثیں اور مکالمے اس قدر دلچسپی اور شدت سے افسانہ در افسانہ قسم کے طرز بیان کے ساتھ چھیڑے کہ باوجود آنتوں کی قرأت کے ساتھ آوازیں دینے کی بھی ہم دونوں دس بجے رات تک نہ اُٹھ سکے اور اس چار گھنٹہ کی نشست میں نہ معلوم کتنی مرتبہ پہاڑی برساتی کو موسم نے گرگٹ کے سے رنگ بدلے۔ مگر ہم اب تک یہ سمجھے ہوئے بیٹھے تھے کہ آج کی رات یہاں کاٹنا ہی ہے۔ جب دس کا گھنٹہ آفس کلاک نے بجایا اور نہال میاں نے الٹی کلائی پر نظر کر کے ذرا کرسی پر ہل جل کر انگڑائی لی تو میں نے ڈاکٹر صاحب کا انداز بھی مائل بہ تکلم اس خاص موضوع پر دیکھا اور میرے تحت الشعور میں عنقریب یہ آواز گونجتی سی معلوم ہوئی کہ آپکے بستر کہاں ہیں کھانا وغیرہ کھا لیا جائے۔ آپ آرام کریں۔ سفر کی تکان ہے"۔ مگر میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے فرمایا ہاں دس بج گئے اور آپ کے لئے راستہ بھی نیا ہے" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے نصف منٹ توقف کیا اور میں سوچنے لگا۔ "یا الٰہی کہاں کا راستہ نیا ہے؟ —— اور ہمیں کہاں جانا ہے سناٹوریم کے قواعد کے مطابق ہم کاٹج وارڈ میں تو ٹھہر نہیں سکتے۔ پھر ہمکو کہاں کا نیا راستہ بتائیں گے ڈاکٹر صاحب!۔ اسوقت آدھی رات گئے۔ کیا کھڈ میں اتاریں گے؟" —"جی ہاں مریض کے ساتھ مہمان تو ٹھیر نہیں سکتا"۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب کھڑے ہو گئے۔ پہلے تو چند انگلیاں دفتر کی گھنٹی پر ماریں پھر دروازہ کے قریب جا کر آوازیں دینی شروع کیں۔ رمضانی۔ عبداللہ۔ شبراتی۔ فقیرا۔ کلوا سب مر گئے بے ایمانو" —— پھر چند سکنڈ توقف کر کے کچھ مجبور سے انداز سے برآمدے میں اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا رکتے ہوئے فرمایا۔ "وہ —— ہوں۔ ان۔ یہ۔ یہ دیکھئے مغرب کی جانب یہ جو پگڈنڈی اُتری ہے۔ اس کے اختتام پر چند کوارٹر آپ کو ملیں گے۔ ان میں سناٹوریم

کا ٹنڈیل ملے گا وہ آپ کو Guest House پہنچا دے گا۔ بہت ٹھیک اسوقت بارش بھی نہیں ہے" اور نظر کرتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں لمبی سی ٹارچ تھا کر "شب بخیر سلام علیکم وعلیکم اسلام" کا تبادلہ ہوا اور ہم باہر اور وہ اندر چلے گئے ہیں اور نہال میاں دونوں اپنی اپنی جگہ پر نادم اور خفیف چپ چاپ راستے پر پڑ لئے اور تقریباً نصف راستہ اونٹ کی پیٹھ کے زاویوں میں یہی معمولی سڑک پر طے کرنے پائے ہوں گے کہ ٹارچ کا بلب ایک دم use ہو گیا اور ہم دونوں موسم برسات کی پہاڑی رات میں پگڈنڈی پر کھڑے ایک دوسرے کا منہ تکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے برابر کی گھاٹی میں سے بادل کا کالا کالا بخار اُٹھا۔ خفت کی وجہ سے .... ہم میں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ہمت تو ویسے بھی نہ پڑتی تھی اس روشنی کے ایک دم گل ہو جانے نے واقعات کی برودت اور بڑھا دی اور پھر ہم نے مجبوراً چپ چاپ نم اندھیری فضا میں کالی کالی بحر ظلمات کی سی موجوں کے رحم وکرم پر اپنا سفر جاری کیا۔ میں تو پہاڑی راستوں پر اندھیرے اُجالے تھوڑا بہت چلنے کا عادی ہوں۔ مگر نہال میاں کہ یہ پہلا موقعہ تھا۔ میں پہاڑی کا سہارا لئے کہیں پر دھکے کہیں پر ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا تھا۔ مگر جب میں نے غور کیا تو دیکھا کہ نہال میاں ڈارون کی تھیوری پر رجعت کر کے کئی دور پیچھے اپنے قدیم ترین بھائی بندوں کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں کی مدد سے سرگرم رفتار ہیں مگر نہ مجھے یہاں پر ہنسنے کا موقع تھا اور نہ نہال میاں کو رونے کی فرصت —— نہ معلوم کتنی دیر "چلنا" تو کہنا غلطی ہے البتہ "لڑھکنے" کے بعد ہم نے چند لب راہ بنی ہوئی کوٹھڑیوں کے سامنے خود کو کھڑا پایا —— باوجود ماحول کی اجنبیت اور اس اندھیری پر بدحواس شغر کے ہم کو ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یاد تھے نہال میاں نے ہانپتے ہوئے تھرتھراتی آواز میں !! "ٹنڈیل جی" "ٹنڈیل جی" کہہ کر ایک کوٹھڑی کے کواڑ کھٹ کھٹائے تقریباً ۵ منٹ تک آوازیں دینے کے بعد ٹنڈیل جی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی مگر ایک کی دو اور دو کی چار تا کجے جب ہم دونوں کی آوازوں کا تسلسل اور تواتر کتوں کی بھونک میں تبدیل ہو گیا تو بالآخر ٹنڈیل جی آنکھیں مسلتے ہوئے نکلے اور تقریباً ۵ منٹ میں ہم انہیں شناخت

کرا سکے کہ ہم ان صاحب کے ساتھ آئے ہیں جو ۲۵ کا ٹج بورڈ میں وارڈ میں آج ہی داخل ہوئے ہیں اور ہم لوگ اسی وقت Guest House میں قیام کریں گے ٹنڈیل جی نے نیند کا خمار اتارنے کیلئے ایک انگڑائی لی۔ اور پے بہ پے تین چار جمائیاں لے کر کہا "مگر شاب (صاحب) بوا وپر بالا گیش ہاؤس میں تو آج وہ مٹھو بابو لوگ ٹھہرا ہے۔ ہاں اب وہاں (نیچے) جگہ ملے گا جمور کو۔" خیر وہ کہیں ٹھہرانا بھئی مگر پہلے ہمارے کاٹج تو پہنچا دو ہمیں"۔ نہال میاں نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "مگر یہاں تو کشنگو باب جی" ٹنڈیل نے جواب دیا۔ او بے دشمن عقل۔ نہال میاں نے جھنجھلا کر کہا اور ہم کب وہاں سونے کو جانا چاہتے ہیں بھائی کام ہے وہاں ہو کر چلیں گے۔ اور پھر میری جانب مخاطب ہو کر کہا بھائی صاحب نہ معلوم Guest House کا کھانا انگریزی یا کیسا ہو لہٰذا کاٹج سے کھا پی کے چلیں گے خانساماں نے کچا تیار کیا ہو گا۔" کاٹج کے برآمدے میں ہم نے اپنے خدمتگار کو بیٹھا پایا ہمیں آتا دیکھ کر وہ برآمدے میں سے اُٹھ کر آگے کو چلا آیا اور اس نے نہائت آہستہ سے کہا۔ "سرکار بہت دبے پاؤں جایئے گا۔ میاں تکان کی وجہ سے نڈھال ہو کر ابھی ذرا غافل ہو گئے ابھی ذرا دیر سے"۔ "اچھا!" نہال میاں نے کہا۔ "دیکھو امام علی۔ کچھ کھانا تیار ہے خانساماں نے کیا کیا؟ کھانا تیار کیا ہے! ہوں اور سرکار تو ڈاکٹر صاحب کے یہاں —— اور میاں بھی کہتے تھے کہ وہ لوگ تو ڈاکٹر صاحب کے یہاں — ہیں" ارے بھئی میں پوچھتا ہوں کہ کیا پکایا ہے خانساماں نے —— نہال میاں نے کہا کچھ؟ نہیں میاں کچھ بھی نہیں۔ سرکار کے لئے تو کچھ نہیں۔ میاں کے لئے یہاں پہنچتے ہی چھوٹی حاضری آئی۔ اور ابھی ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوا کہ رات کا کھانا وہاں سے آیا اوّل تو سرکار میاں بہت تھکے ہوئے اور پھر سرکار خانساماں نے سب چیز سونگھ کر دیکھی یہ اُبلا چرندہ بھلا میاں کو کیا پسند آتا بس سرکار انڈے اور ذرا سا دودھ اُنہوں نے لے لیا اور حضور میاں فرما رہے تھے۔ کہ ہسپتال کے قاعدے کی رو سے وہ ہسپتال کے Kitchen سے کھانے پر مجبور ہیں۔ مگر وہ منع کر رہے تھے اور خانساماں سے کہہ رہے تھے کہ وہاں کا آیا ہوا کھانا ہم نوکر لوگوں کے کام آجایا کریگا

اور میاں کے لئے خانساماں علیحدہ تیار کر دیا کریں گے اور سرکار خانساماں آئے بھی کاہے کے لئے ہیں ——" بے مغزہ کہیں کا۔ بے ایمان نہیں تو، دنیا بھر کی بکواس تو لگائے پڑا ہے۔ اور کچھ پکوا کر نہیں رکھا اُلو نے۔' اچھا ہمارا بستر لیکر فوراً پہنچو وہاں پھر میری جانب مخاطب ہو کر کہا بھائی صاحب چلئے آپ آج وہی گیسٹ ہاؤس کے انگریزی کھانے سے سر مارنا پڑے گا۔ ہرچہ بادا آباد جو کچھ بھی ہو آج تو شام کی چائے بھی نذر ہو گئی سر جھکا رہا ہے۔ ہم چپ چاپ ٹنڈیل جی کی رہنمائی میں پیچ در پیچ اترتے ہوئے راستے پر کبھی پورب کا رُخ کئے ہوئے اور کبھی پچھم کو مُنہ کئے چلتے رہے اور چند منٹ میں ایک بڑی لمبی چوڑی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ اور ٹنڈیل جی کی رفتار میں منزل مقصود کی ایک قربت والی کیفیت پا کر میں نے کہا" وہ کہاں ہے ہمارا ملازم؟ ہوں' اس نے کیا دیکھا ہے آپ کا اور گیسٹ ہاؤس — ہے — ایں؟" اس کے سننے کے باوجود ٹنڈیل جی نے چند قدم اور بڑھائے اور ہم اس لمبی چوڑی روشن عمارت کی ایک لمبائی اور ایک چوڑائی طے کر گئے اور اندر دیکھنے میں اس قدر منہمک ہوئے کہ باوجود یاد ہونے کے بھی اپنے بستروں کو بھول گئے ایک بڑا لمبا۔ چوڑا مشرق و مغرب کی جانب دو رویہ اونچی چھت کا شیڈ دوسرے الفاظ میں مشترک چھت والے پورب اور پچھم رخ کے دو عریض و طویل برآمدے جن کے اندر کی چھت سے ملی ہوئی نصف برآمدے کی چوڑائی تک پتلی لکڑی کی قد آدم سے ذرا کم دیواریں ہر چارپائی کے درمیان حد فاصل یا —— Qartition Wall کہئے اور ہر چارپائی کے قریب ایک ہی شکل کا اسٹول پر ایلومینیم کا تھوکنے کا برتن اور دوسرے پر صراحی اور گلاس سرہانے کی جانب ایک گز بھر سے کچھ کم اونچی لوہے کی جالی دار الماری؛ جس کی چھت پر کارڈ بیورا ٹائل اور کیلشیم کے شربت کی شیشیاں اور ایک ایک دو دو پیالیاں چُنی ہوئی، اور جالی کے اندر کچھ اشیاء خوردنی اور برتن اور دوسری دواؤں کی شیشیاں پائنتی کی جانب لکڑی کی دیوار کے محاذ سے باہر ذرا برآمدے میں ایک ایک میز سفید وارنش دار اور ایک ایک لکڑی کی پھولدار چوبی نشست والی کرسی۔ غرض "تصویرِ بتاں اور حسینوں کے خطوط" کی قسم کے جملہ لوازمات پہلے سے ہی جمع؛ بس نکلنے کی ہی دیر اور شیڈ میں موقع موقع سے پانسو موم بتی کی طاقت کے دودھیا سفید بلب آویزاں جو کم و بیش ہر مریض کی اپنی اس جیتی قبر میں روشنی پہنچا رہے تھے اور جس وقت ہم برآمدے میں سے آہستہ آہستہ گزرتے ہوئے وارڈ کی جانب دیکھتے گزرے تو ہم نے یکے بعد دیگرے کالے گورے مٹیالے پیلے، دبلے پتلے، سوکھے سوکھے، سوتے جاگتے، اونگھتے کلبلاتے، بےحس و حرکت مریضوں کی شکلیں دیکھ کر پہچان لیا کہ Common Ward کامن وارڈ کا شیڈ ہے — شیڈ کے آخیر سرے پر پہنچکر میں نے پھر کہا " ارے بھائی ہمارے بستر! —— بھلا ہم سے بغیر ساتھ لئے چلدیئے اور وہ لیکر کہاں پہنچے گا؟" بستر کا لفظ سُن کر ٹنڈیل جی نے ذرا رک کر قریب کی ایک خالی وارڈ کی جانب اشارہ کر کے کہا" بستر کیلئے کوئی پھکر (فکر) نہیں بابجی (بابو جی) یہ ۱۳ پرسوں مرا ہے اور کل ہی کا ڈِس ان پھے —— (Disinfect) کرا ہؤا ہے۔ شب شمان (سب سامان) ایک تو بستر اچھی ہو جائیگا اور دوسرا ایک اور وارڈ کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ دوسرا ابھی بہت بھلی اچھ (بھلا اچھا) ڈِش ان پھے (Disinfect) کیا ہؤا یہاں (وہاں) سے آجائے گا" اور میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے"۔ خیر وُہ ہمارے لئے بستروں کا حسن انتظام اور قابلیت نہ دکھائے۔ بستر تو ہمارے کاٹج سے آ ہی جائیں گے وہ بتائے وُہ کہاں ہیں وُہ حضور کا وہ — " میں نے کہا۔ پیشتر اس کے کہ ٹنڈیل جی کچھ جواب دینے پائیں ایک دم ایک جانب سے ملازم کی آواز آئی جو بستر لئے بھٹکتا پھر رہا تھا۔ ٹنڈیل جی ہم کو جہاں کا تہاں کھڑا چھوڑ کر اس کو جواب دیتے ہوئے جھپٹے اُدھر تیر قسم کا ملازم پہاڑ کی اندھیری سڑک پر ٹنڈیل کی آواز کی جانب لپکا۔ دونوں کا ایک دوسرے کو پانے کا راستہ مختلف ہو گیا اور چکیے چکوے والا حساب ہو گیا۔ اب ملازم بستر لئے ہمارے پاس کھڑا ٹنڈیل جی کو آواز دے رہا تھا۔ اور ٹنڈیل جی اس کی جگہ سے ہم کو پکار رہے تھے۔ درمیان میں گھاٹی حائل تھی اور ہمیں معلوم نہ تھا۔ کہاں پر ہے اور ہم کامن وارڈ (Common Ward) کے شیڈ —— پر کھڑے ٹنڈیل کو آوازیں دلوا رہے تھے۔ ملازم بستروں سے لدا ہمارے پاس کھڑا تھا اور دراصل یہ انتظار ہمیں موت سے زیادہ شدید معلوم ہوتا تھا نہال

میاں بھوک سے بیتاب ہوکر بار بار لاحول پڑھ رہے تھے ــــ "ارے بھائی وہ کہاں ہے مہمان خانہ" نہال میاں نے کہا ذرا پوچھو تو پھر ادھر ہی کو بڑھیں یہاں کھڑے کھڑے کیا کریں" ملازم نے نہال میاں کا یہ جملہ زور سے دہرا دیا جس پر تیز تیز بڑھتے ہوئے ٹنڈیل نے کہا۔ "ہوئیں (وہیں) جہاں بابو لگ کھڑا ہے"۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظر کی تو ہمیں مہمان خانہ کہیں نظر نہ آیا میں نے آہستہ سے کہا ــ "بھئی یہاں کہاں ہے مہمان خانہ؟" پھر شیڈ کی جانب اشارہ کرکے کہا ــ "یہ چند دن کا مہمان خانہ تو یہاں ضرور ہے" ــ "ایں - ! یہ !!" ہم دونوں ایکدم اُچھل پڑے جیسے ہی ٹنڈیل جی نے اس کو اس کی جانب اشارہ کیا جو پورب رخ کی وارڈ سے پچھم رخ کی وارڈ میں آنے کا بشکل کوئی راستہ تھا۔ اور ساتھ ہی نہایت پھرتی کے ساتھ کھول بھی دیا۔ یہ مہمان خانہ نہال میاں اور شاید میں بھی لفظ Guest House کی رعایت سے ستھرے پُرتکلف کمرے اپنے خیال میں سمجھے ہوئے تھے۔ جن کے ملحق ایک ڈرائینگ ہال اور چند باتھ روم ہوں گے۔ نہال میاں نے ٹنڈیل جی سے دروازہ کھولتے وقت آہستہ سے کہا جو میں سُن تو نہ سکا۔ مگر ٹنڈیل جی کے جواب سے سمجھ گیا کہ ایک مرتبہ کسی بھوکے سے کسی نے پوچھا تھا کہ "ایک اور ایک" تو اس نے جواب دیا "دو ڈبل روٹی" چنانچہ ٹنڈیل جی نے فرمایا۔ باب جی ـ" ٹنڈیل جی نے ذرا اہمیت اور تعجب کے ساتھ کہا ـ" کھانا یہاں کہاں!" ــــ یو (یہہ) تو آٹھ آنہ روج (روز) کا ہے کھانا تو اُدھر بارے میں بھی نہیں ہوتا جہاں دو روپیہ روج پڑتا ہے حجور ــ دوپہر کو چھ آنے یہاں کا من بارڈ کے رسوئی میں بھیجدیتے تو اش ٹیم پر کھانا ملتا ـ اور یہاں دوپہر بارے گیش ھوس میں ڈیڑھ روپیہ بھیج دیتے ہیں تو ایک ٹیم سے دوسرے ٹیم مل سکتا ہے ــ" نہال میاں نے یہ سُن کر "اچھا" کہکر ٹھنڈی سانس بھری اور ٹنڈیل جی نے گیسٹ ہاؤس کھولا اچھی خاصی بلیک ہول۔

سناٹوریم کے قبیلہ والی مخصوص سیاہ آہنی مسہریاں اور ان پر ناریل کے ریشہ کے موٹے گدے اور سفید چادریں بچھی ہوئیں اور پائنتی کی جانب نہایت سلیقہ کے ساتھ تہ کئے ہوئے دو دو لال کمبل لگے ہوئے کوٹکی المعروف بہ گیسٹ ہاؤس میں پہلے سے موجود تھے۔ ٹنڈیل جی نے فرمایا بسترے تو ہیاں (یہاں) بدو (بدبو) ہے پرسوں تک تیرہ نمبر کے نا ــ بھائی ہیاں ہی تو رہے ــ اور پھر جلدی سے کہا ان بستروں کے اوپر باب جی کے بسترے لگادو۔ گرم رہے گا کھوب ہ"ــ نہیں! نہیں!!" نہال میاں نے کہا ــ ہٹاؤ ایک دم ہمارے پاس گھر کے گرم کپڑے ہیں غرض وہ مارکین کی چادروں اور گبرون کے گدوں والے بستر وہاں سے اٹھا ڈالے گئے اور اُن پر ہمارے اپنے گھر والے بستر لگائے گئے ــ نہال میاں نے اُوپر چھت اور دیواروں کی جانب دیکھ کر کہا ـ" اوہو روشنی کا بھی انتظام نہیں ہے"۔ ٹنڈیل جی نے ایک روشن دان کی جانب اشارہ کیا ـ جس میں سے نہ معلوم کہاں سے روشنی منعکس ہوتی تھی۔ غالباً کسی دیوار سے یا بڑی سڑک کی روشنی میں سے اور پھر اس کا انعکاس سفید چونے کی دیوار پر پڑنے کی وجہ سے نام Guest House کی کوٹکی میں شاید ½ موم بتی کی طاقت سے یکساں پھیل جاتی تھی ـ قہرِ درویش برجانِ درویش ہم دونوں خاموش اور نادم اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے ـ ملازم اور ٹنڈیل چلے گئے ـ ان کے جانے کے بعد نہال میاں نے دونوں جانب کے کواڑ بند کر لئے ـ خلاف اُمید واقعات ظہور پذیر ہونے کی اہمیت اور خفت نے ہماری زبان بند کر دی تھی اور ہم نفس معاملہ پر بغیر ایک لفظ بھی بولے ہوئے چپ چاپ لیٹے ہوئے تھے۔ میری پائنتی نہال میاں کے سرہانے سے ملی ہوئی یا دوسرے الفاظ میں میرے پاؤں اور اُن کا سر ــ نہال میاں غیر معمولی جوشیلا اور پُر مذاق نوجوان ہے۔ اور ہمہ وقت حتیٰ کہ جاں کاہ تفکرات اور روح فرسا حادثات میں ہنسنا اور ہنسانا اس کی خصلت میں ودیعت ہے اور علیٰ ہذا القیاس میرے متعلق بھی میرے دوست یہی رائے رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت ہم سب چوکڑی بھولے ہوئے تھے ـ نہال نے ایک مرتبہ کہا ـ بھیّا ـ قبر کا مزہ آرہا ہے" میں نے کہا ـ چپ رہو ـ آنکھ میچتے سویرا ہے سو جاؤ ــ" مجھے تو یوں بھی نئی جگہ اور خاص طور سے پہاڑ پر نیند بڑی مشکل سے آتی ہے اور پھر جگہ بھی کتنی معتدبہ !! ـ اس کے ساتھ ساتھ پیٹ گھوڑ دوڑ کا میدان ـ مگر چونکہ میں ذرا سپاہی نفس قسم کا شکاری آدمی

واقع ہوا ہوں۔ لہذا بھوک کی شدت کی شکایت کرنا خلاف شان بھی سمجھتا ہوں اور پھر یہاں امی جان تو بیٹھی ہی نہ تھیں۔ چپ چاپ آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ نہال میاں بےچین کروٹیں بدل رہے تھے اور بار بار" اُونھ اُونھ" کر اُٹھتے تھے۔ مجھے تو اپنی نیند کی جانب سے یہ اطمینان تھا۔ البتہ دل میں" مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی" تمنا تھی کہ کاش اگر ذرا آنکھ لگ جائے تو صبح کسقدر آسان ہو جائے۔ جب نہال میاں کی بےچینی درجہ اعتدال سے تجاوز کرنے لگی تو میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا" کیوں میاں کیا ہے؟"

" بھیا دس بجے دن کے کھائے ہوئے ہیں" نہال میاں نے جواب دیا۔

" بس بڑی آنت چھوٹی آنت کو کھا رہی ہے۔ بس کچھ پوچھئے نہیں حال"۔ میں اس کو کوئی جواب نہیں دے سکا۔ البتہ اتنا کہا۔" میاں سونے کی کوشش کرو"۔ ہم بمشکل دس منٹ نیند کو منا پائے ہوں گے۔ کہ ایکدم پچھم والی وارڈ سے کھانسی کی آواز آئی" کھوں۔ کھوں۔ کھوں۔" اور اس کے جواب میں" کھیں۔ کھیں۔ کھیں۔" اور ساتھ ہی" دھاں۔ دھاں۔ دھاں" اور پھر پورب رخ کی وارڈ سے" ٹھس۔ ٹھس۔ ٹھس۔ اور خوں خوں خوں آخ تھو۔" یکدم تمام وارڈ گونجنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ زیادہ غور کرنے پر وسیع تر معلوم ہونے لگا۔ اِدھر اُدھر گھاٹیوں اور پہاڑیوں پر چار چار پانچ پانچ سو گز کے فاصلے پر جہاں اور دوسری وارڈیں واقع تھیں اور مجھے شکار کیمپ کی خاموش راتوں کا سماں یاد آگیا جہاں ایک مور جھو کے یا گیدڑ کی آواز پر یکے بعد دیگرے کے مور یا جھوکوں یا گیدڑوں کی سلسلہ وار جواب دیتی ہوئی آوازوں کی زنجیر ایسی بنتی ہے کہ ایسا گمان ہوتا ہے کہ تمام ہندوستان کے مور یا جھوکے اس وقت یکے بعد دیگرے اور کبھی کبھی سب ایکدم مل کر بول رہے ہیں۔ پہاڑی برسات کی بھیانک رات!۔ ٹی بی کا ماحول مٹیالے سوکھے جسموں بلکہ ڈھانچوں کی آبادی مستقل تحت الشعور میں ذہنی اور نفسیاتی خوف و ہیبت کا احساس!۔ معاذاللہ!! باوجود پان پان سیر روئی کا لحاف لپیٹے ہونے کے جسم کا ایک ایک رونگٹا کھڑا ہوا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں چند منٹ کے لئے سویا مگر اس میں شک نہیں کہ دس پانچ منٹ کو غنودگی کی کیفیت ضرور طاری ہوئی یکدم میری چارپائی پر حرکت ہوئی اور میرا کاندھا پکڑ کر نہال میاں نے روشندان کی جانب سے آتی ہوئی روشنی کی جانب اشارہ کرکے بہت آہستہ سے میرے کان کے قریب منہ لاکر کہا" بھیا! ٹا۔ ٹا۔ ٹی۔ ای۔ بی" یقین مانئے ویران اور دور افتادہ گھنے جنگلوں میں سنسان اندھیری راتوں میں بارہا تنہا یا ساتھیوں کی ہمراہی میں شیر کے شکار کے سلسلہ میں مچان پر بیٹھا ہوں اور ایک خاص وقت پر نومشق ہندوستانی بیچارے تو خیر چیز کیا ہیں نوجوان فوجی انگریزوں کو خوف کے مارے پتہ پانی ہوتے اور ایڈے آتے دیکھا ہے۔ بعض بعض اوقات جب شیر دبے پاؤں فطری سبک خرامی کے ساتھ اندھیرے میں کھسکتا ہوا سا آتا ہے اور ایک تاریک سایہ سا متحرک معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت جنگل تاریکی، خاموشی اور اس کے ساتھ ساتھ شیر کا یہ مخصوص انداز اور خود شکاری کے تحت الشعور میں اُس کے شکار کی اہمیت سب مل کر ایک بھوت جیسے مافوق البشر خوف کے قسم کا سا شدید احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر یقین مانئے ایسے دو چار مواقع پر میرے اعصاب اور حسیات نے میرا ایسا کامیاب ساتھ دیا تھا کہ ایک کے بعد دوسرا راؤنڈ چلانے کی نوبت نہ آتی تھی۔ مگر اس وقت روشندان میں سے آتی ہوئی روشنی میں ایک ایک انچ سائے متحرک دیکھ کر پہلی نظر میں ایک دفعہ تو مجھ پر وہی خوف طاری ہوگیا جو غالباً میرے بعض ساتھیوں پر شیر کی اس مخصوص طرز کے ساتھ آمد پر میرے ساتھ مچان پر بیٹھے ہی بیٹھے ہوا ہوگا۔ نہال اوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف سے سکڑا ہوا مضبوطی کے ساتھ میرا کندھا پکڑے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں دبوچے بیٹھا تھا اس کا چہرہ واضح طور پر نظر آنے کے قابل تو روشنی تھی نہیں البتہ کھانسی کی آوازوں کی طرف اشارہ کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ سمجھ رہا ہے کہ اس کھانسی کی حرکت سے مریضوں کے پھیپھڑوں پر سے یہ ٹی بی اڑ اڑ کر آ رہے ہیں ایک منٹ کے اندر ہی میں نے اس کے طفلانہ خوف کو سمجھ کر اپنی ڈری ہوئی کیفیت کو درست کرلیا اور اب مجھ پر رجعت و تنفر کا دورہ دورہ تھا اور ٹھنڈے ٹھنڈے گیلے گیلے نم سے لحاف اور گدوں پر جو موسم کی رطوبت سے

نم تھے۔ جیسے زندہ چینپ دار ٹی بی لپٹے ہوئے ہیں۔ نہال نے پھر کہا "ٹی بی بھائی صاحب" اور مجھ پر باوجود پہلی ہی نظر میں یہ سمجھ لینے کے کہ یہ ان پتنگوں کے سائے ہیں جو بلب کے ارد گرد اڑ رہے ہیں۔ اور دور سے اتنے لمبے ہو ہو کر دیوار پر منعکس ہو رہے ہیں۔ محض ٹی بی کا نام سُن کر اور پھر ان متحرک سایوں کو دیکھ کر ہی خوف کی ایک ہلکی جھرجھری طاری ہو گئی۔ نہال نے مجھے مضبوط پکڑ لیا اور تقریباً غریب کانپتا ہوا سا مجھے چمٹ گیا اور دراصل میں کیا اس کو سمجھاتا دونوں جانب یہ حال تھا کہ اس کو میری اور مجھے اس کی خالہ یاد آ رہی تھی۔ دوسرے لمحے میں اپنی حالت پر قابو پانے میں کچھ کامیاب ہو گیا اور میں نے بچوں کی طرح اس کو چمکارتے ہوئے کہا۔ "احمق۔ باہر بلب پر پتنگے اڑ رہے ہیں، یہ اُن کے لمبے لمبے سائے پڑ رہے ہیں۔ ٹی بی ایسے ہوتے ہیں؟" اور پھر میں نے اس کو اُٹھا کر اس کی چارپائی پر بھیجدیا۔ دماغ نیند کی نیم بیہوشی کیفیات سے آزاد ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اپنے اپنے بستروں پر ٹی بی کے خوف سے مضبوطی کے ساتھ لحافوں میں منہ لپیٹ کر لیٹ گئے۔ کھانسی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اب مریضوں کے سینوں کا بلغم اکھڑ چکا تھا۔ خوں۔ خوں۔ خوں، اخ تھو۔ گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ اور آق تھو۔ اپنے اپنے نرخرے اور حلق کی ساخت اور جرجر کیفیت مطابق خالی کھوکھلے پھٹے ڈھول جیسے سینوں سے ہر ضرب پر بدلتی ہوئی سی آوازیں پست و بلند ہو رہی تھیں اور ایک دفعہ تو سارا سناٹوریم یوروپین وارڈ سے لگا کر کامن وارڈ تک گونج اُٹھتا ہوا مجسم خوں خوں، آخ تھو معلوم ہو رہا تھا۔ پڑوس کے مریضوں کی کھچ کھچ اور اخ آق تھو کے بعد آہستہ آہستہ آہ۔ آہ۔ آہ کے بعد سکون پر آجاتے تھے کہ نئے لچھے جدید پھندے اور تازہ الجھنیں پڑنے لگتیں اور پھر وہی کہانی غریب زبان کے حلق اور سینے سے دہرانے لگتے اور پھر ٹیلیفون کے ٹرنک کال کا سلسلہ از ابتداء تا انتہا ایک لڑی میں جڑ جاتا۔ اور ہم دونوں اوپر ٹی بی۔ نیچے ٹی بی۔ دائیں ٹی بی۔ بائیں ٹی بی۔ اپنے اس گور صفت اور قبر صورت ٹی بی Guest House میں ٹی بی کے ہی مہمان بنے تابوت نما اور لحد صورت ہسپتالی مسہریوں پر دراز تھے تمام رات ایک پہاڑی چڑیا کی آواز تسلسل اور تواتر کے ساتھ رات کے سناٹے کا جُز

سا بنی ہمارے کان میں آتی رہی۔ یہانتک کہ خوبصورت اور خوش الحان پہاڑی کاگ (کوا) کی آواز نے قیامت سے پیشتر والی رات کے ختم ہونے کا شیریں مژدہ سُنایا اور ہم جوئے شیر کی منزل مقصود پر پہنچنے کا اطمینان کر کے اُٹھے اور اپنے چوہے دان سے آزاد ہو کر بغیر پیچھے دیکھے سیدھے کالج پہنچے اور منہ اندھیرے خانساماں کو جگا کر آملیٹ پراٹھے حلوا، اور چائے طیار کرا کر دوزخ شکم کی آنچ پر چند چھینٹے مارے ہمیں آج کا تمام دن اور تمام رات اپنے پروگرام کے مطابق یہاں گذارنا ہے، قاعدے کی رُو سے مریض کے ساتھ وارڈ میں ہم اس ایک دن اور ایک رات میں دو مرتبہ میں ایک ایک گھنٹہ کر کے دو گھنٹے سے زیادہ نہ گذار سکے تھے اور نہ کچھ کھا پی ہی سکتے تھے خیر آخری چیز تو کوئی بات نہ تھی ہندوستانی اپنا مال خود چُرا کر کھانے کی ہزاروں ترکیبیں جانتے ہیں۔ اور اس کے خوب عادی بھی ہیں۔ لہذا نہال میاں خانساماں کو قورمہ کباب بھنڈی دوپہر کو اور قلیہ کوفتہ پسندا اور بریانی شام کو پکانے کا چپکے سے حکم دیکر وارڈ سے چلے آئے حالانکہ میرے اور ان کے دل میں اپنی اپنی جگہ یہ گمان غالب تھا۔ کہ آج تو ضرور کم از کم ایک وقت کی چائے اور رات کے کھانے پر ڈاکٹر صاحب ضرور مدعو کریں گے۔ مگر پچھلے چودہ گھنٹہ کے واقعات کی خشکی اور برودت کی وجہ سے.....

.... اس کے اظہار کی ہمت اور اس موضوع پر تبادلہ خیال کی جرات ہم دونوں میں سے کسی کو نہ تھی۔ جب سورج ایک بانس سامنے کی پہاڑی سے بلند ہو گیا۔ تو ہم کالج سے نکلے ہم تن Where to go and what to do? کے سوالیہ نشان بنے ہوئے مگر آج کی رات کے جائے قیام کی تلاش میں اور آج کے دن کے کاٹنے کی فکر میں بظاہر سوائے ڈاکٹر کے اور کوئی در نظر نہ آتا تھا۔ نہال میاں نے ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کی جانب مُنہ کر کے کہا "آج بھی کمبخت رحم کھا کر دو چارپائیاں دے دے تو سو لیں رات کو" ہم دونوں کے پیر لے شعوری طور پر ڈاکٹر کے بنگلے کی ہی جانب والی چڑھائی پر چڑھنے لگے ہم — اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب ایک بڑی عالیشان عمارت ایک وسیع پارک کے درمیان دیکھی۔ جس کے پھاٹک پر ایک خوبصورت بورڈ لگا ہوا تھا۔ اور اس عمارت کے بلند شیڈ پر بھی جلی قلم میں سنہرے حروف

میں Recreation Hall لکھا ہوا تھا اور اس کے اندر اور باہر گھاس اور بنچوں پر لوگ چھوٹے چھوٹے کھیلوں اور ہنسی مذاق میں اِدھر اُدھر چلتے پھرتے بیٹھے کھڑے نظر آئے یہ سناٹوریم کے شاہکار تھے وہ مریض جو صحت یاب ہو چکے ہیں اور اب تندرستی کی حدود کو مضبوط ترین بنانے کیلئے سناٹوریم میں مقیم تھے اور ڈاکٹر کی ہدائت کے مطابق بیرونی اور اندرونی کھیل اور تفریح میں ایک خاص وقت تک حصہ لے سکتے تھے۔ نہال میاں یہاں گھس گئے اور ہمیں اس مجمع میں ٹی بی کا ماحول قطعاً محسوس نہ ہوا مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال کے قدوں کا تقریباً ہال ہر قسم کے جدید و قدیم قسم کے تاش بچسی اور شطرنج سے لیکر بیگو ٹل، کیرم، پنگ پانگ تک کھیلوں کے اعلےٰ اور نفیس لوازمات سے پُر اور دورِ حاضر کے مشہور ادبی شاہکار اور خوش رنگ کتابوں کی الماریوں سے مزّین دیواروں پر اعلےٰ آرٹ کے نمونے اس بڑے کمرے کی لمبائی اور چوڑائی کی مطابقت سے آویزاں تھے۔ نصف گھنٹہ بعد یہ ہال بند ہو گیا اور مریضوں کے آرام کی گھنٹی ہو گئی۔ ہم پھر رات کے قیام کی تاک میں ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کی طرف گئے مگر وہ راؤنڈ پر جا چکے تھے دوپہر تک ہم Recreation Hall کے پارک اطلان کی مرمریں نشستوں پر جگہ جگہ مختلف فوّاروں کے کنارے بیٹھے اپنا صبح کا ناشتہ ہضم کرتے اور وقت گذارتے رہے۔ اور دوپہر کو چوروں کی طرح کاٹج میں داخل ہوئے اور اپنا کھانا کھا کر چپکے سے نکل آئے اور پھر پارک میں وقت گذاری کرنے لگے ــــ ڈاکٹر صاحب کا ہم نے پانچ بجے شام تک دل ہی دل میں انتظار کیا۔ اب آج روٹی کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ لہٰذا صرف پُرسکوں اور صاف جائے قیام کی تاک میں ہم ڈاکٹر صاحب کے بنگلے یورپین وارڈ سے چاء پینے کے بعد جانے کا ارادہ کرنے لگے۔ خانساماں نے کہا "سرکار وہاں سے پھر رات گئے اٹھ کر آئیں گے آپ لوگ۔ اور اس وقت میاں غافل ہو چکے ہوں گے۔ آپ کو بھی تکلیف ہو گی کل رات کی طرح لہٰذا بجائے اس کے کہ آپ لوگ اس وقت چاء پی کر جائیں۔ بہتر ہے۔ کہ جو کچھ کھانا ہے وہ سب میں نے تیار کر ہی لیا ہے۔ وہ کھا کر ہی جائیں"! نہال میاں بیچارے رات کی بھگتے ہوئے تھے فوراً تیار ہو گئے اور ہم

اچھی طرح کھانا کھا کر اور ایک پیالی اُوپر سے چائے کی پی کر فرصت سے ڈاکٹر صاحب کے بنگلے میں قریب مغرب پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نماز کی تیاری میں تھے۔ ہمیں بھی ایک ایک لوٹا گرم پانی کا پیش ہوا۔ اور ہم نے بھی ڈاکٹر صاحب کی امامت میں تقائیت کے اظہار میں خوشامداً نماز پڑھی۔ بعد نماز ڈاکٹر صاحب اور ہم دونوں اطمینان سے باتیں کرنے بیٹھے اور ہم نے بیٹھتے ہی رات کی مہمان نواز گیسٹ ہاؤس کی میز بانیوں کا تذکرہ دے مارا مگر شرم کے مارے اپنے پیٹ کے اندر کی واردات بیان نہ کی صرف گیسٹ ہاؤس کے واقعات بیان کئے جس پر انہوں نے بہت کچھ رسمی اظہار افسوس کیا اور پھر کل کی باقیماندہ سنجیدہ سیاسی اور مذہبی بحثیں چھڑ گئیں اور یہ کچھ طے نہ ہو سکا کہ آج کی شب ہمیں کونسی قبر میں داخل ہونا ہے۔ قریب نو بجے کے جب ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کسی نتیجہ پر پہنچی تو ہم نے رخصت چاہنے کی تمہید اُٹھائی "ڈاکٹر صاحب آج ہمیں تو نیند آنے سے رہی وہاں" نہال میاں نے کہا ــــ کیوں؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "کھانسی کی آوازیں۔ وحشت انگیز کراہنے اور کیا عرض کروں" میں نے کہا۔ "اچھا اچھا دیکھئے" ــ ڈاکٹر صاحب کے انداز میں پھرتی اور تیزی مترشح ہونے لگی" میں سمجھا کہ اب بستر لانے کا حکم کسی ملازم کو پکار کر دینے والے ہیں۔ مگر جب انہوں نے میز پر سے سلپ اُٹھا کر کچھ لکھا تو ہم نے خیال کیا کہ شائد منڈیل کے نام لکھ رہے ہیں کہ بستر گیسٹ ہاؤس سے یہاں بنگلے پہنچانے کا انتظام کرے لیکن انہوں نے سلپ بجائے ملازم کے آواز دیکر دینے کے۔ میری جانب بڑھائی۔ موٹا موٹا سُرخ پنسل سے نسخہ پر Sleeping draught لکھا ہوا تھا۔ "طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری" انگریزی لباس پہننے والا مُلّا صفت ڈاکٹر ہمیں اپنے بنگلے میں کھڑے کھڑے دور سے ہی ایک لال لال بتی کی جانب اشارہ کرکے ہمیں بتا رہا تھا۔ دیکھئے وہ سناٹوریم کی نائٹ ڈسپنسری ہے۔ دیکھا آپ نے وہ نیچے سُرخ بلب جو روشن ہے وہاں جا کر آپ ایک ایک خوراک پی لیں اور نہایت میٹھی نیند آ جائے گی جائیے ہم ذمہ دار ہیں" اچھا اب شب بخیر۔ السلام علیکم۔ ڈاکٹر صاحب اندر تشریف لیگئے اور نہال میاں نے کہا سبحان اللہ! فعل الحکیم لایخلو عن الحکمة" کہکر برآمدے

سے قدم نیچے اتارا۔ اور نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ جب ہم دونوں بغیر منزل مقصود کا سفر کل والے اونچے نیچے راستہ پر۔ اونچے نیچے پتھروں اور روڑوں کے رحم و کرم پر۔ بحر ظلمات کی موجوں میں ڈوبتے اچھلتے کر رہے تھے صبح کی طرح جوں کے تیوں Where to go and what to do کا مجسمہ بنے ہوئے۔ جس وقت دھکوں اور ٹھوکروں نے ہمیں ـــ ریگری ایشن ہال کے محاذ پر پہنچایا۔ تو نہال میاں مجھ سے بغیر ایک لفظ بھی کہے ہوئے جیسے ہم پہلے سے یہیں آنا طے کر کے چلے ہیں۔ پارک کے پھاٹک میں داخل ہو گئے۔ میں نے "ایں! کہاں؟" کہکر ان کی تقلید کی اور بغیر میرے مشورے یا میری جانب دیکھے ہوئے بھی سامنے کے دروازہ کی کھڑکی کا شیشہ اپنی چھڑی سے توڑ کر اور اندر ہاتھ ڈال کر چٹخنی کھولکر اندر کو دیتے ہوئے "آیئے" کہا۔

میں نے کہا ٹھیک ہے واہ!! ـــــ

ع "کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ" ہم نے دو نو بلیرڈ کی جہازی قسم کی میزیں پہیوں پر کھسکا کر ایک دوسرے سے ملا دیں۔ پھر چھوٹی چھوٹی میزیں ان دونوں بڑی قبروں کے ارد گرد جمع کر کے ایک حصار سا باندھا اور تمام ہال میں سے دس بارہ مختلف نمونوں کے بجلی کے ہیٹر جمع کر کے چھوٹی میزوں پر قاعدے سے لگا دیئے اور پھر سب کے ہولڈر فٹ کر کے دہکا دیئے اور بتی گل کر کے ہیٹروں کی سُرخ سُرخ روشنی کے عکس اور گرمی کی لہروں کے سہارے ہم دونوں بلرڈ ٹیبلوں پر اپنے اپنے اوورکوٹ سر تلے رکھ کر سو گئے "تن تکیہ. بن بسرام - جہاں لیٹ گئے وہیں آرام

دونوں وقت چرا کر اپنی روٹی کھائی تھی اب چرا کر اپنے کالج میں سو بھی سکتے تھے۔

لہذا یہ چوری بجائے اپنے یہاں کہنے کے سناٹوریم میں کی۔ سلونی سلونی گرمی کی پُر کیف لہریں ہماری اوپری فضا میں پھیل کر ہم پر لحاف کی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ اور ہماری رگ وپے میں برانڈی کا سا سرور پیدا کر رہی تھیں۔

اور ہم اس برقی حصار میں محو استراحت تھے۔

بھائی صاحب فیضو خلیفہ کے حمام کا مزا آ رہا ہے۔ نہال نے کہا۔

میں نے کہا چپکے لیٹے رہو۔

کوئی چوکیدار یا راستہ گیر بھانپ گیا تو کان پکڑ کر اٹھا دیئے جاؤ گے۔ سو جاؤ اب اطمینان سے۔

اور یہاں تک کہ پہاڑی سورج کی حیاتِ نو دوڑاتی ہوئی کرنیں نو کروڑ بیس لاکھ میل کی مسافت طے کر کے ہماری اس گرما گرم آرام گاہ کی گرمی میں اضافہ کرنے کو آ پہنچیں۔

ساتھ ہی کل شام کے شطرنج کے ملتوی شدہ کھیل کے دو مریض جو منکر نکیر کی طرح - سرہانے کھڑے ہوئے ہم سے جواب طلب کر رہے تھے۔ "واہ صاحب واہ"!

"ہماری رات کی لگی لگائی سب بساط بگاڑ دی"!

"خوب!"

"یہ بھی کوئی سرائے مقرر کر لی ہے یا مسافر خانہ"

ایں!؟؟ ـــــ

نہال نے آواز سُن کر ایک پُر اطمینان جمائی لی اور لمبی انگڑائی لے کر مُنہ پر دونوں ہاتھ پھیرے اور لیٹے ہی لیٹے ترچھی گردن کر کے اس کی جانب کچھ ایسی تادیبی نظروں سے دیکھا - جیسے خاص ابا کے مکان والی خوابگاہ میں مداخلت پر آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب طلب کر رہے ہیں۔

میں آنکھیں ملتا ہوا میز پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میرے عین سامنے سنگِ موسے اور سنگ مرمر کی شطرنجی مہر پڑی ہوئی تھی۔

اور اس پر ایک گول ہیٹر بدستور اپنی لال لال آنکھیں دہکا رہا تھا - ہاتھی دانت اور سینگ کے بادشاہ، وزیر اور رخ و فیل ادھر اُدھر فرش پر منتشر تھے ؛

عبادت بریلوی

کچھ ادب کے بارے میں

صدیاں گذر گئیں، جگ بیت گئے لیکن ازل سے ادب کا جو سوتا انسانی ذہن و دماغ، فہم و ادراک اور جذبات و احساسات سے پھوٹا تھا وہ آج بھی اسی طرح بہہ رہا ہے۔ اس درمیان میں ہزارہا انقلاب آئے۔ حوادث زمانہ نے بیسیوں کروٹیں لیں اور دنیا کے نقشہ کو بدل کر رکھ دیا۔ لیکن کوئی تبدیلی کوئی انقلاب، کوئی حادثہ ادب کے اس بہتے ہوئے چشمے کو خشک نہ کر سکا برخلاف اس کے جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا وقت کے ساتھ ساتھ ادب کے قدم ترقی کی شاہراہوں پر برابر تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے۔ زمانہ کی مشاطگی اس کو زیادہ سے زیادہ بناتی سنوارتی گئی چنانچہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ حسین بھی ہوتا گیا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ دل موہ لینے والی کیفیت بھی پیدا ہوتی گئی۔ زمانے کے تغیرات و انقلابات اس کو ختم تو نہ کر سکے لیکن اُس کی خصوصیات کے اثرات کو ہر دور کے ادب نے ضرور قبول کیا۔ اور بڑی حد تک وہ انہی تبدیلیوں۔ انہی تغیرات اور انہی انقلابات کے سانچوں میں ڈھلتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ادب میں ہر زمانہ کی تہذیب کے جو اثرات کار فرما ملتے ہیں وہ بالکل ایک عکس معلوم ہوتا ہے۔ اس زمانے کے سماجی معاشی اور اقتصادی حالات کا، زندگی کی ساری تصویریں اس میں ہمیں چلتی پھرتی، اور جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔

لیکن آخر ادب کیوں پیدا ہوا؟ کیوں اس کا سوتا پھوٹا اور پھوٹ کر چشموں اور دریاؤں کی صورت اختیار کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ، ہر زمانے، ہر دور اور ہر ماحول میں برابر بہتا رہا؟ کیوں اس کو حوادثات زمانہ کی بادسموم خشک نہ کر سکی؟ انقلابات و تغیرات کیوں اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکے؟ اور وہ کیوں ہر دور اور ہر زمانے کے سماج کو سرسبزی و شادابی کی مسکراہٹوں سے روشناس کرتا رہا؟ اور کیوں اس نے بعض اوقات خود زمانے کی بہتی ہوئی ندی کے دھارے کے رُخ کو بدل دیا؟

یہ سوالات ادب کے ہر اس طالب علم کے لئے بڑے ضروری اور اہم ہیں جو ادب کو سوچنا سمجھنا اور اس کے متعلق کوئی صحیح راہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ ان سوالات کو پوری طرح ذہن نشین کئے بغیر ادب کو پوری طرح سمجھا نہیں جا سکتا چنانچہ اس کی اہمیت ہی کا نتیجہ ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ ہر دور میں ان سوالات پر بھی ادبیات کے طالب علم غور و خوض کرتے رہے اور انہوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف طریقوں اور مختلف زاویوں سے ان پر روشنی ڈالی۔

——— ہاں تو ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ادب کیوں اور کس طرح وجود میں آیا؟ ادب کی قدامت کا اندازہ تو صرف اس کی ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ جس وقت انسان اس دنیا میں نیا نیا آیا تھا اُسی وقت سے اُس نے ادب کی تخلیق شروع کر دی تھی۔ تخلیق کا جوہر اور تخلیق کی خواہش انسان کے اندر بالکل فطری ہے۔ چنانچہ انسان نہ صرف ادب بلکہ ہر چیز کی تخلیق میں لطف محسوس کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو انسان ہی کی تخلیق ہے۔ کہ انسان اس تخلیق میں جس قدر لذّت، لطف اور عشرت سے ہمکنار ہوتا ہے اس کی مثال کسی اور چیز کی تخلیق میں ملنی مشکل .... ہے۔ انسان کی تخلیق کا پیش خیمہ جنسی خواہشات کی تکمیل و تسکین ہے۔ جس میں اس کو ایک ایسی لذت جسمانی و روحانی ملتی ہے۔ کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اور چیزوں کی تخلیق کی خواہش ہے کسی ایسی چیز کی تخلیق جو روزمرہ کے استعمال میں آتی ہو اور جس سے انسانیت کو راحت و آرام ملتا ہو یا پھر کسی ایسی چیز کی تخلیق جس کو صرف دیکھ کر ہی وہ لطف، لذت اور مسرّت حاصل کرتا ہو۔ یہ بھی تخلیق کی اس فطری خواہش کا نتیجہ ہے جو انسان کے اندر قدرت کی طرف سے ودیعت کر دی جاتی ہے۔ بالکل اس طرح ادب کی تخلیق ہے جس میں انسان کی اس فطری خواہش کو دخل ہے۔ البتہ اس کی نوعیت کسی قدر بدل ضرور جاتی ہے۔ دوسری تخلیقات کا تعلق مادیت سے ہے لیکن ادب کی تخلیق میں مادہ کو دخل نہیں۔

برخلاف اس کے اس کی نوعیت روحانی ہے۔ انسان کے جذبات واحساسات میں جو موجیں برابر اٹھتی رہتی ہیں ان کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا دینا ادب کہلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جذبات کا پتلا ہے اور ابتدائے آفرینش میں تو وہ سوائے جذبات کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔ ان دنوں اس میں عقل وشعور کے عناصر پوری طرح بیدار نہیں ہوئے تھے۔ وہ چیزوں کے متعلق سوچ سمجھ کم سکتا تھا۔ خارجی چیزیں اور ان سے پیدا شدہ ذرا ذرا سے واقعات اس کے جذبات کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں ایک ایسے پتھر کا کام کرتے تھے جس سے اس میں مدوجزر اور تلاطم کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جذبات کے سمندر کی ان متلاطم موجوں کو وہ الفاظ کا روپ دے دیتا تھا جس کو آج ہم ادب کے تحت شمار کرنے کیلئے مجبور ہیں۔ دنیا میں نووارد انسان کو اگرچہ لکھنے پڑھنے کا شعور نہیں تھا لیکن اس کے باوجود جہاں تک ادب کا تعلق ہے۔ اس کی تخلیقی کوششیں جاری تھیں، چنانچہ ابتدائی زمانہ میں ادب کے نشانات ہمیں ان گیتوں کی شکل میں ملتے ہیں۔ جو انسان کے وقتی تاثر کے زیر اثر تخلیق کئے گئے تھے اور جن کو لوگوں نے زبانی یاد کر لیا تھا اور جب لکھنے کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ تو ان کو پہلے پتوں پر اور پھر کاغذ اور کپڑے وغیرہ پر لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔ یہ گیت یا تو عشقیہ تھے۔ جن میں جنسی فعل کی لذت اس کے متعلقات اور اس سے پیدا شدہ مختلف کیفیات کا بیان ہوتا تھا یا ان نامعلوم قوتوں کی بڑائی کا تذکرہ جن کے سامنے انسان کو جھک جانے میں ایک لذت محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال یہ ادب کے ابتدائی نقوش تھے جو وقت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بنتے سنورتے رہے۔ اور جن کے موضوعات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

سوال یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کو انسان نے خود اپنے تک محدود کیوں نہیں رکھا اور عالم آشکارا کر دینے کی کوشش کیوں کی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں یہ خواہش بھی بالکل فطری ہے کہ جو خیالات اس کے دل میں پیدا ہوں ان کو وہ بہتر سے بہتر طریقہ سے دوسروں تک پہنچائے۔ انسان ایک سماجی مخلوق ہے۔ وہ ایک دوسرے سے مل جل کر رہتا ہے۔ اور اس پر جو کچھ گذرتی ہے۔ جو سانحات بھی اس کے دل پر اپنے نقوش چھوڑتے ہیں۔ حالات کی جن کروٹوں سے بھی وہ متاثر ہوتا ہے ان سب کو کسی نہ کسی صورت میں اپنے ساتھیوں تک پہنچا دینا اس کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے، چنانچہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے جس چیز کی بھی تخلیق کرتا ہے اس میں پہلے تو اس کو ذاتی طور پر سکون اور لذت ملتی ہے۔ اور دوسری طرف سماج کے دوسرے افراد اس سے دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر انسان کے دل میں یہ خواہشات نہ ہوتیں تو ادب اپنی موجودہ صورت میں ہمیں ہرگز نظر نہ آتا۔

ایک طرف تخلیق کی فطری خواہش اور دوسری طرف اپنے آس پاس کے لوگوں سے اپنے دل پر بیتی ہوئی حالت کو ظاہر کر دینے کا خیال! — ان دونوں عناصر نے مل کر ادب کو پیدا کیا۔ اسی وجہ سے ادب بیک وقت انسان کا ایک اضطراری اور سماجی فعل ہوا۔ جس میں آفاقیت کی جھلکیاں بسیرا لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بعض جگہ اس نے اپنے مخصوص ماحول اور سماج کی عکاسی ضرور کی لیکن بڑا ادب وہی سمجھا گیا جس میں عالمگیریت اور آفاقیت کے عناصر کی پوری طرح کارفرمائی تھی۔ غرض ادب پھیلا اور بڑھا اور چونکہ وہ انسانوں کی اپنی چیز تھی۔ اس لئے انہوں نے اس سے دلچسپی لی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مختلف لوگوں کے ادبی مذاق میں اختلافات رہے لیکن ادبی ذوق ان میں رہا ضرور! یہ بات کسی قدر عجیب ضرور ہے کہ ہر دور اور ہر زمانہ میں سماج کے افراد انفرادی اور اجتماعی طور پر ادب سے دلچسپی لیتے رہے۔ ادبی ذوق اچھا یا بُرا، کم یا زیادہ ہر شخص کے دل میں رہا۔ بعضوں نے اپنے علم، شعور اور مذاق کی بلندی اور شستگی کے باعث اس میں نکھار پیدا کر لیا اور بعضے ان باتوں کے فقدان کے باعث ایسا نہ کر سکے لیکن ذرا گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ کیونکہ جیسے انسانوں کے اندر ادب کو تخلیق کرنے کی خواہش بالکل فطری ہے اسی طرح اس سے دلچسپی لینا بھی ان کی فطرت میں داخل ہے۔ کون انسان ایسا ہو سکتا ہے۔ جو دوسرے انسانوں کے جذبات واحساسات سے دلچسپی نہ لیتا ہو اور پھر جب اس جگ بیتی کے روپ میں اس کو آپ بیتی کی تصویریں نظر آئیں اور پھر جب ان کا پیش کرنے والا فنکار اُن میں ایسے رنگ بھر دے جو ان کو فنکاری کے زیور سے آراستہ وپیراستہ کر کے تمام تر جمالیاتی خوبیوں کا نمونہ بنا دے!

انسان کے اندر حسن کا احساس سب سے زیادہ قوی ہے وہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس حسن کی تلاش میں رہتا ہے، اور ادب چونکہ فن کاری کے ساتھ ساتھ چند خاص خیالات اور چند خاص جذبات و احساسات کو پیش کرنے کا نام ہے۔ اسلئے اس میں حسن کا پیدا ہونا لازمی ہے اور جب کسی چیز میں حسن پیدا ہو جاتا ہے تو انسان اس سے دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ فطرتاً حسن کا شیدائی ہے۔ چنانچہ ادب سے انسان کی دلچسپی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں فنکارانہ اور صناعانہ حسن کی دنیائیں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ اس سے دلچسپی لیتا ہے کیونکہ اس کے وجود سے اس کے احساس جمال کو تسکین ہوتی ہے۔ یہ احساس جمال کوئی اٹل چیز نہیں یہ بھی وقت و ماحول، حالات و واقعات، افتاد طبع اور ذہنی رجحانات کے اختلافات کے باعث ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا ہے۔ لیکن احساس جمال کا ہونا ہر انسان کے اندر لازمی ہے خواہ وہ کم ہو یا زیادہ، اچھا ہو یا بُرا! یہ ممکن ہے کہ ادب یا فنون لطیفہ کا ایک شاہکار ایک ہی وقت میں ایک ایسے انسان کی دلچسپی کا باعث بنے اور اس کے احساس جمال کو تسکین دے جس کے مزاج افتاد طبع اور ذہنی رجحان میں اور اس شاہکار کی خصوصیات میں ہم آہنگی ہو۔ اور اس وقت وہی شاہکار ایک دوسرے انسان کی جس کے مزاج کو اس سے مناسبت نہیں، طبیعت منغض کر دے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ کوئی انسان کسی بھی خوبصورت چیز کو دیکھ کر متاثر نہ ہو۔ جہانتک ادب کا تعلق ہے اس میں تو حسن ہوتا ہی ہے چاہے اس کے موضوعات بذات خود حسین نہ ہوں بلکہ کریہہ اور بدصورت ہوں۔ یہ تو فنکار کا کمال ہے کہ بدصورت سے بدصورت چیز میں بھی حسن کی رعنائی اور دلکشی پیدا کر دے۔ بہرحال ادب ایک ایسا مقام ہے جہاں پر فنکار کی صناعی بدصورت چیز کو بھی حسن کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے ادب کا مقام بہت بلند ہو جاتا ہے کیونکہ ہماری سماجی زندگی میں کوئی اور مقام ایسا نہیں آسکتا جہاں بدصورت چیز کو بھی حسین بنا کر پیش کیا جا سکے۔ یہ شرف صرف فنون لطیفہ اور ادب ہی کو حاصل ہے پس انسانی زندگی میں اس کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

ادب میں یہ حسن کی خصوصیت بڑی اہمیت کی مالک ہے اور بذات خود اپنے اندر ایک افادیت رکھتی ہے۔ انسان کو ذہنی اعتبار سے ایک سکون بخشنا اور اس کی دلچسپی کا باعث بننا کوئی بیکار باتیں نہیں۔ کیونکہ یہ بھی اس کو ذہنی اور جسمانی اعتبار سے صحت مند بنانے اور صحت مند رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ حسن کی تخلیق بھی ایک کارآمد بات ہوئی جس کو انسانی زندگی سے کسی حالت میں بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ایک طرف تو اپنی حسن کاری اور جمال آفرینی کے باعث ادب انسانی زندگی میں اہمیت کا مالک ہوا اور دوسری طرف ایک سماجی فعل کی حیثیت سے اس نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اس کے ایک سماجی فعل ہونے کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ انسانوں کے جذبات و احساسات کی تصویریں پیش کرتا ہے ان پر گذری ہوئی کیفیات کے نقشے بناتا ہے۔ ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو اجاگر کر کے پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے ان تمام چیزوں کا تعلق سماج سے ہے اور چونکہ ادب کی جولانگاہ یہی نہیں اس لئے اس کے سماجی فعل ہونے سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا ادب اور سماج کے اس تعلق نے ادیبوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی پیش کی ہوئی تصویروں میں افادیت کا رنگ بھریں تاکہ ان کی ادبی تخلیقات سے دلچسپی لینے والوں پر ان کا کوئی بُرا اثر نہ پڑ سکے۔ چنانچہ قریب قریب ہر دور کے باشعور ادیبوں کے ہاتھوں اس کی شعوری کوششیں جاری رہیں۔ مختلف خیالات کے لوگوں نے اپنے خیالات و نظریات کے پرچار کیلئے اس کو آلہ کار بنایا یہی وجہ ہے کہ افادیت کے عناصر سب سے زیادہ ادب میں داخل ہوتے گئے۔ اور اکثر زمانوں میں انہوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ سماج کے افراد ادب کی اس ساحرانہ کیفیت سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ ادب کی ان خصوصیات نے ان کی توجہ اپنی طرف زیادہ سے زیادہ مبذول کر لی۔

ادب کے یہ ہی دو پہلو، جمالیاتی اور افادی، گویا ادب کی جان ہیں ان ہی دونوں کے سہارے اس کی عمارت کھڑی ہے اور انسانی زندگی میں یہ ہی وہ چیزیں ہیں جو زندگی کو مکمل ترین اور اعلیٰ ترین اقدار کا حامل بناتی ہیں۔ انسان بغیر دلچسپی اور دلکشی کے زندگی کے دن نہیں گذار سکتا اور

اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگیوں میں اس کو مسرت کی تلاش ہوتی ہے وہ لذت حاصل کرنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اگر یہی لذت اور مسرت کا خیال صرف لذت اور مسرت تک محدود کر دیا جائے اور اس میں افادیت کو دخل نہ ہو تو پھر سماجی زندگی میں انحطاط کے جراثیم کا پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ اور اگر افادیت، صرف افادیت ہی تک محدود ہو کر رہ جائے اور انسان اس میں کوئی لذت حاصل نہ کر سکے تو پھر زندگی کے بے رنگ و بو ہو جانے کے امکانات بہت قوی ہیں۔ اس لئے انسان ان دونوں چیزوں کا سنگم اپنی زندگی میں دیکھنا چاہتا ہے اور چونکہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت ادب میں اس کو گلے ملتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ اس لئے ادب اس کے لئے محبوب ترین چیز بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کی خصوصیات اور انسانی زندگی کی ضروریات میں ہم آہنگی ہے۔

لیکن چونکہ سماج کا ہر فرد ایک طرح پر نہیں سوچ سکتا اسلئے ادب کے متعلق بھی مختلف خیالات و نظریات ہر دور میں قائم ہوتے رہے بعضوں کی انتہا پسندی نے اس کو صرف جمالیات ہی تک محدود کر دیا اور بعضے اس کو صرف افادیت سے ہم آہنگ سمجھتے رہے ادب برائے ادب کا نظریہ جس کے علمبرداروں میں اسکرو وائلڈ۔ پیٹر اور کیٹس وغیرہ سب سے زیادہ پیش پیش تھے۔ ایک زمانہ میں بہت ہی زیادہ مقبول ہوا۔ اس دبستان کے خیال کے مطابق ادب سے کسی قسم کی افادیت کی طلب بد مذاقی ہے ادب تو صرف حسن آفرینی کا نام ہے۔ وہ کسی بھی چیز کو اپنا موضوع بنا سکتا ہے۔ اس سے افادیت کا کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کو کوئی سماجی فعل سمجھنا چاہئے ان کے نزدیک حسن سچائی؟ اور سچائی حسن —— اور حسن کی چونکہ انسانی زندگی میں بڑی اہمیت ہے اس لئے ادب کو صرف اس خوبی سے آراستہ و پیراستہ ہونا چاہئے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ادب حسن کی تخلیق میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے لیکن اس کو صرف حسن کی تخلیق تک محدود کر دینا اور اس سے اس کی سماجی فائدہ کی توقع نہ رکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ ادب بہر حال انسانوں کے درمیان رہ کر پیدا کیا جاتا ہے۔ انسانوں ہی کے جذبات و احساسات۔ افعال و خیالات۔ اقوال و کردار اس کے موضوعات بنائے جاتے ہیں۔ اس لئے ایک بڑی شخصیت رکھنے والا ادیب اپنے فن سے کچھ کام بھی لینا چاہتا ہے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ ادب انسانی زندگی سے ہم آہنگ ہے۔ تو اس کے ذریعے وہ اپنے مخصوص خیالات و نظریات کا پرچار کیوں نہ کرے۔ تاکہ سماج کے افراد اس سے زیادہ اثر قبول کریں۔ ان خیالات نے ایک دوسرے دبستان کی بنیاد ڈالی جس نے ادب کو زندگی کا ترجمان سمجھا اور ادب برائے ادب کے نظریئے کو لغو و لایعنی قرار دیا۔ یہ مباحث بہت ہی اہم نہیں آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے اور ان میں اتنی تازگی ہے کہ باوجود قدیم و فرسودہ ہونے کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی شمع کل ہی روشن ہوئی ہے۔

یہ مباحث چاہے کتنی ہی شدت کے ساتھ جاری رہیں اور اس کے نتیجے میں چاہے کتنے ہی مختلف اسکول کیوں نہ قائم ہو جائیں۔ لیکن ادب کا سماجی فعل ہونا اور اس کا زندگی سے ہم آہنگ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ ادب برائے ادب کے وہ علمبردار جو ادب اور آرٹ کو صرف حسن کاری ہی سمجھتے تھے اگر ان کی تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں سماجی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ وہ بھی اپنے وقت کی پیداوار ہیں ان میں بھی ان کے ماحول کی تصویریں جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی نظر آتی ہیں — یہ دوسری بات ہے کہ ان لوگوں نے اپنے فن کو حسن کاری ہی تک محدود کر دیا اور اس سے کوئی بڑا کام نہیں لے سکے۔ لیکن وہ سماجی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ ان کے درمیان اُن کا بسیرا تھا۔ چنانچہ ان کی تخلیقات میں حسن کاری کے عناصر موجود ہیں۔ سماجی زندگی کی تصویریں موجود ہیں لیکن چونکہ وہ عمل کی دُنیا میں اپاہج ہیں۔ اسلئے ان کا فن کسی بڑے پیغام کا حامل نہیں بعض جگہ تو صرف حسن کاری کا خیال ان کی تخلیقات میں سماجی زندگی کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ ان اقدار کو جو سماجی زندگی کی نظر میں کسی خاص مرتبے کی مالک نہیں بلکہ مضر اور مخرب اخلاق ہیں۔ ان کو فنکاری کے ذریعہ کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سماج کے افراد پر اس کا اثر خراب پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کا مجموعی تاثر ان کے اوپر بڑا گہرا ہوتا ہے جس کے باعث وہ اسی رنگ میں رنگ جانا چاہتے ہیں۔

ادب کے مفید اور غیر مفید بنانے میں ادیب کی شخصیت کو بڑا دخل ہے کیونکہ وہی ادب کا خلاق ہوتا ہے۔ سماجی حالات کو تو وہ اپنی ادبی تخلیقات کے ذریعہ پیش کرنے کیلئے مجبور ہی ہے کیونکہ اس کے درمیان رہ کر اس کے نشیب و فراز سے متاثر ہو کر ادب کی تخلیق کرتا ہے اور جمالیاتی پہلو بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا کیونکہ بغیر اس کے ادب صحیح معنوں میں ادب ہوتا ہی نہیں لیکن سماجی حالات اور سماجی مسائل کو فنکاری کے ساتھ پیش کرتے وقت اگر اسکا شیوہ اس کو یہ بتا دے کہ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان حالات کو زیادہ سے زیادہ سنوارنے کی کوشش کرے اور وہ اس عنصر کو اپنی تخلیقات میں سمو بھی دے۔ تو اس کی تخلیقات کا اثر بڑھ جائے گا اور سماج کے افراد کے لئے اس کے خیالات ایک پیغام کی حیثیت حاصل کریں گے جن کے مفید ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بڑی شخصیت رکھنے والے ادیب جو کوئی پیغام دیں، بہت ہی کم پیدا ہوتے ہیں ادبی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک داستان ہے سماجی حالات کے مد و جزر اور نشیب و فراز کی لیکن ایسے ادیبوں کی تعداد کم نظر آتی ہے۔ جنہوں نے اپنے ماحول کو سدھارنے کی کوشش کی ہو۔ ہر زمانے کا ادب اپنے خارجی حالات کے زیر اثر بدلتا رہا۔ چنانچہ ایک دور کا ادب دوسرے دور کے ادب سے مختلف نظر آتا ہے۔ ابتدائے آفرینش میں انسان نے جو ادب گیتوں وغیرہ کی صورت میں پیش کیا تھا۔ وہ اس زمانہ کے ادب سے مختلف ہے۔ جس کی تخلیق اس وقت ہوئی جب انسان نے تہذیب کے حدود میں قدم رکھ لیا اس وقت کے ادب میں اُن کی سادگی و معصومیت ضرور ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ فنی اعتبار سے ان میں ایک بھدا پن ہے جو اس زمانہ کے فنکارانہ شعور کی پستی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے موضوعات وہی ہیں جو اس زمانہ کی خاص چیزیں تھیں۔ حسن و عشق یا پھر کائنات کی مختلف چیزوں کی برتری اور ان کے سامنے جھک جانے کا خیال! اسی طرح قدیم یونان و روم اور ہندوستان کا ادب قرونِ وسطےٰ کے ادب سے بالکل مختلف ہے۔ ہومر۔ ارسٹوفینز۔ بالمیکی۔ کالیداس کا تقابل شیکسپیئر۔ گوئٹے۔ شلر۔ شیلے۔ کیٹس۔ حافظ۔ سعدی۔ میر اور غالب سے بالکل عبث ہے۔ وہ سب اپنے اپنے وقت اور ماحول کے عکاس ہیں اور ان کے زمانوں کے سماجی حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح ادب کی تاریخ میں دوسرے ادوار ملتے ہیں مثلاً انقلاب فرانس سے قبل کا ادب یا روسی انقلاب سے قبل کا ادب جو پیش رو ادبیات سے بالکل مختلف ہے۔ اس زمانے میں پیدا ہونے والے ادیبوں کی تخلیقات میں جارحانہ انداز ہے۔ آگے بڑھ جانے والی کیفیت ہے۔ سماج کے افراد کو جھنجھوڑ کر اُٹھا دینے والی حالت ہے۔ لیکن ادبی تاریخ میں ایسے مواقع بھی ملتے ہیں۔ جب انتشار و پریشانی کے زمانے میں ادیبوں نے زندگی کی الجھنوں سے تنگ آکر صنف نازک کے کیف ہم آغوش اور شراب ناب کی لہروں کے سرور میں بسیرا لیا۔ اور ان تمام حالات سے چشم پوشی اختیار کی جو اس زمانے کے اہم اور ضروری مسائل تھے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ایسے ادیب پامال شخصیتوں کے مالک تھے۔ جس کی وجہ سے وہ حالات پر قابو نہ پا سکے اور انہوں نے ان سے فرار اختیار کیا۔

بہر حال ادب اپنے ماحول اور حالات و واقعات کے تقاضوں سے بدلتا رہا۔ فکریات کے مد و جزر اور علوم کی نئی نئی کروٹوں نے اس میں انقلابات کئے اور اس نے خود بھی ان تمام نئی نئی باتوں کو اپنے دامن میں جگہ دینے کی کوشش کی جس کی وجہ سے ادب میں خود ایک انقلابی اور ارتقائی کیفیت رہی۔ اس نے بیسیوں نئے نئے رنگ بدلے سینکڑوں نئی کروٹیں لیں اور کہیں ایسا بھی ہوا کہ ساتھ ہی ساتھ اس نے خود اپنے زمانہ کو بھی بدل دیا۔ یوں ادب کے مد و جزر پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ تک وہ پروہتوں اور پجاریوں۔ رشیوں اور منیوں کے پنجوں میں اسیر رہا۔ یہ مذہبیات کا زمانہ تھا۔ اسوقت ادب مذہب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد جاگیرداروں کا دور شروع ہوا۔ جب ادب نے بڑے بڑے امیروں اور سرداروں کے گن گائے اور ایک زمانہ تک یہی حالت رہی — بلکہ یہ زمانہ تو ادبیات کی تاریخ میں سب سے زیادہ طویل ہے۔ لیکن یہ صورت ہمیشہ قائم رہنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اس نے بھی کروٹ بدلی اور صنعتی انقلاب کے بعد ادبیات کی تاریخ میں بالکل ایک نیا دَور شروع ہوا۔ جس میں مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے ادب میں انقلاب آیا۔ اس کو جمہور سے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی گئی۔ اس

زمانہ کی تحقیقات ہیں عوام کا بیان ہے اور وہ انہی کی زندگی اور زندگی کے مسائل کے گرد گھومتی ہیں۔ اس درمیان میں مختلف ممالک کے اندر مختلف قسم کے سیاسی۔ سماجی اور معاشی انقلابات ہوتے رہے۔ جس کا اثر وہاں کے ادبیات پر بھی پڑتا رہا۔

جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام ایک زمانہ تک ادب پر بری طرح چھایا رہا۔ کیونکہ خود زندگی اس میں اسیر تھی اور آج بھی اس کے اثرات پوری طرح مٹ نہیں سکے۔ لیکن اب حالات میں بہت کچھ انقلاب آچکا ہے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی ہیں اور وہ موت کی ہچکیاں لے رہے ہیں۔ اس لئے آج کا ادب بھی انہی تمام حقیقتوں کی ترجمانی میں مصروف ہے۔ اور اب اس کے مسائل صرف جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کو مٹانا ہی نہیں بلکہ ان کے باعث اور بہت سے مسائل جو پیدا ہو گئے ہیں۔ اور جن کے باعث ابن آدم کو سکون و اطمینان میسر نہیں۔ ان کو بھی وہ موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس میں جمہوری عناصر کی فراوانی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ان کے دکھ درد کا مداوا چاہتا ہے۔ وہ انسانیت کو ذلت، پریشانی، کس مپرسی۔ بدحالی اور بے بسی کے تاریک اور مہیب گڑھوں سے نکال کر خوشی اور مسرت سے ہمکنار کر دینے کا متمنی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب ادب زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تو وہ عوام کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ جمہور کا بھی خواہاں ہے تو پھر عوام اس کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔؟ کیسے اس کا چشمہ خشک ہو سکتا ہے۔ وہ ابد تک اسی طرح رہے گا۔ فنا کی اندھیاریاں اس پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ ابدیت ادب کا دوسرا نام ہے ۵

ظہور نظر

احتجاج

اُف یہ جاں سوز سیاہی یہ غلامی کی نمود
اُف یہ بے رُوح تمدّن یہ حقائق پہ قیود
ذہن ہے مائلِ پیکار
قلم ہے معذور
دل ہے آمادۂ گفتار
زباں ہے محصور
سہمے سہمے سے ہیں افکار
کہ جیسے کچھ چور
گاؤں سے ہٹ کے بھٹک جائے جواں چرواہی
اور یہ گیت یہ اشعار
ہے جن میں مستور
سرد کملایا ہوا پیار
یا شوقِ مجبور
اپنی منزل سے ہیں بیزار
کہ جیسے کہیں دور
شام کے بس میں تھکا ماندہ اکیلا راہی
وہ ہوئی صبح نمودار
اُفق ہے مسرور
وہ ہوئے خواب سے بیدار
کسان اور مزدور
اب نہیں شب کی سیہ کار
حکومت منظور
"نہ یہ بے رُوح تمدّن نہ حقائق پہ قیود"
"نہ یہ جاں سوز سیاہی نہ غلامی کی نمود"

مسعود حسین

جذبۂ لازوال

یہ مرا حسنِ خیال
مژۂ انجم میں جو بھرتا ہے جمال
تیری ناکام محبت کا مآل!
یہ مرا حسنِ عمل نقشِ خیال
میرے لافانی تصور کے یہ سارے امثال
تیری ناکام محبت کے کمال!
ناپ سکتے نہیں جس کو مہ و سال
جس کے احسان گنانا ہے محال
لیکن اے جانِ کمال!
زندگی بے پر و بال
اور امید کے جال
بن گئے اب تو وبال
ہو کے سرشارِ مئے شوقِ وصال
آرزو اٹھتی ہے بالائے زمین، دشت و جبال
(سوئے آں عالمِ امثال و جمال)
لیکن افلاک کو چھو لے — یہ محال!
گرتی ہے زار و نزار و بے حال
اے مری جانِ وصال!
آخرش اس کا مآل؟

ڈاکٹر محی الدین

قطب شاہی زبان اور ادب

قطب شاہی سلاطین کی حکومت سرزمین دکن میں تقریباً دو سو سال تک رہی۔ اس سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ یوں تو دسویں صدی ہجری کے آغاز ہی سے گولکنڈے کے صوبہ دار کی حیثیت سے اس ملک پر حکمران تھا۔ لیکن اپنے بادشاہ کی وفاداری اور احترام کی خاطر ۹۲۴ھ تک اس نے اپنی مطلق العنانی کا اعلان نہیں کیا۔ اس سال سے ۱۰۹۸ھ تک اس کی اولاد اس ملک پر قابض رہی یہاں تک کہ سلطان ابوالحسن قطب شاہ کو شہنشاہ اورنگ زیب کے مقابلہ میں آٹھ ماہ کے محاصرہ کے بعد شکست ہوئی۔ اور اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس خاندان میں کل سات بادشاہ ہوئے۔ جن میں آخری دو یعنی عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تاناشاہ کا عہد زیادہ تر مغل سلاطین کی مزاج داری اور ماتحتی میں گزرا۔ اور اسی وجہ سے سیاست کی طرح اس زمانے کی زبان اور ادب بھی متاثر ہوئی۔ کیونکہ زبان ہمیشہ سیاست کی محکوم ہوتی ہے۔ آزاد قومیں اپنے ادب اور زبان کے ارتقاء میں بھی آزاد ہوتی ہیں۔ اور جہاں کوئی قوم غلامی کا شکار ہوئی اس کی زبان اور ادب بھی اس کی غلامانہ ذہنیت کا اثر قبول کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں قطب شاہی زبان اور ادب کے مطالعہ کے سلسلہ میں ابتدائی اور آخری کوششوں میں بین فرق نظر آتا ہے۔

قطب شاہی عہد میں اردو زبان دکن میں عام طور پر رائج تھی اور یہی یہاں کی مختلف زبانوں کا مثلاً مرہٹی تلنگی۔ کنڑی وغیرہ کے بولنے والوں کے درمیان ایک مشترکہ زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس ملک میں داخل ہوتے وقت اس زبان نے جو شکل حاصل کر لی تھی۔ اسکا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ اس پر برج بھاشا کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ پرتھوی راج کی سلطنت کے خاتمہ کے بعد پنجاب کی جو فوجیں دہلی میں داخل ہوئیں وہ اپنے ساتھ ایک زبان لیتی آئی تھیں۔ جو سرزمین پنجاب میں ترکی اور فارسی بولنے والے مسلمانوں اور پنجابی پراکرت بولنے والے ہندوؤں کے میل جول سے بنی تھی اور یہ زبان یا اس کے بولنے والے دہلی اور اس کے نواح میں جو برج کا علاقہ کہلاتا ہے۔ زیادہ عرصہ تک نہیں رہنے پائے تھے۔ کہ سلطان علاؤ الدین خلجی اور ملک کافور کی فوجوں کے ساتھ اور بعد کو سلطان محمد تغلق کے حکم کی بناء پر دہلی چھوڑ کر دکن چلے آئے۔ اور جو لوگ دکن ہی میں رہ گئے ان کی زبان چونکہ برج بھاشا کے علاقہ سے دور جا پڑی تھی اس لئے برج بھاشا سے متاثر ہوئے بغیر آزادانہ نشوونما حاصل کرنے لگی۔ اس کے برخلاف اردو بولنے والے جو لوگ شمالی ہند اور خاص کر برج کے علاقہ میں رہ گئے ان کی زبان رفتہ رفتہ برج بھاشا سے اتنی متاثر ہوئی کہ بعد کو تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔ کہ اس میں کتنا حصّہ برج بھاشا کا ہے اور کتنا پنجابی پراکرت کا۔ لیکن جب دکن کی اردو سے شمال کی اردو کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ تو یہ فرق بآسانی نظر آتا ہے ان دونوں زبانوں میں الفاظ، صرف ونحو، تلفظ، اور لب ولہجہ کا جو فرق پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہی ہے۔ یعنی شمال کی اردو ایک طرف برج بھاشا سے اور دوسری طرف پوربی ہندی سے متاثر ہوئی اور دکن کی اردو کے اطراف واکناف چونکہ آریائی زبانیں کم تھیں۔ اس لئے اس نے زیادہ تر اپنی قدیم خصوصیتوں کو باقی رکھا۔ اور کچھ گجراتی اور مرہٹی زبانوں سے متاثر ہوئی۔ کیونکہ یہ دونوں بھی آریائی زبانیں تھیں۔ اس کے برخلاف تلنگی اور کنڑی نے اردو کو بہت کم متاثر کیا۔ کیونکہ یہ اس کی ہم جنس نہ تھیں۔ بلکہ ایک دوسرے ہی خاندان السنہ یعنی دراوڈی سے تعلق رکھتی تھیں اور قاعدہ ہے کہ ہمیشہ ایک ہم جنس دوسرے ہم جنس سے متاثر ہوتا ہے۔

پورے قطب شاہی عہد کی اردو کتابوں میں چند ہی مثالیں ایسی ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی اردو نے صرف معدودے چند الفاظ ہی کی حد تک تلنگی کا اثر قبول کیا تھا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ جو شہر حیدرآباد کا بانی تھا۔ اور جس نے فارسی و اردو دیوانوں کے

علاوہ تلنگی میں بھی ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ اس کے ضخیم اردو دیوان میں جو ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور جو اسی سال مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ تلنگی کے صرف چند ہی الفاظ نظر سے گذرتے ہیں۔ تلنگی میں ایک لفظ "دُرا" ہے۔ جس کے معنی ہیں آقا و مالک کے۔ اس لفظ سے محمد قلی نے کئی جگہ کام لیا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ لفظ دُرا سے" درا ہی" اور درا ہی پھراتا کی ترکیبیں عام طور پر رائج ہو چکی تھیں۔ چنانچہ محمد قلی نے آخری محاورے کو حکومت کا اعلان کرنا اور آقائی" کے اظہار کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ" ایم رے ایم" کا فقرہ بھی استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں کیا رے کیا۔ پہلے لفظ کی مثال میں یہ شعر قابل ذکر ہے:۔

خدا قطب شاہ کوں شہنشاہ کر کر — سو سارے جگت میں دُرا ہی پھرایا

اسی لفظ کی ایک اور مثال یہ ہے:۔

چوٹی کا پھُندنا ہے طاوس کا تلاجیوں — حاجب ہوائی سیتیں اپنا دُرا ہی پھرائے

لفظ ایم رے ایم کی مثال میں ایک نظم کا یہ مقطع بڑا دلچسپ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ" قطب شاہ نے اپنے سانولے محبوب سے ہندی زبان میں کہا کہ ایم رے ایم"۔ سانولی قطب شاہ کی مشہور محبوبہ کا لقب تھا جس کے متعلق اس نے اپنے کلیات میں متعدد نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں۔ اس مقطع میں وہ کہتا ہے:۔

نبی صدقے قطب شاہ سانولی سوں — بچن ہندی سوں بولے ایم رے ایم

قطب شاہی خاندان کے تیسرے بادشاہ ابراہیم قلی قطب شاہ سے پہلے کی اردو کتابوں کا اب تک پتہ نہ چل سکا۔ یہ بادشاہ ۹۵۷ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۸۸ھ میں اس نے وفات پائی۔ اس کے عہد کے اردو شاعروں میں ملا خیالی۔ محمود۔ فیروز۔ ملا احمد قابل ذکر ہیں جن میں سے مؤخر الذکر کی ایک مثنوی نامکمل حالت میں دستیاب ہوئی ہے۔ ملا وجہی بھی اسی دور میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں عروج حاصل کیا۔ انہوں نے اس بادشاہ کی عالم شہزادگی کی داستان عشق ایک مثنوی" قطب مثنوی" میں بیان کی ہے۔ جس میں وہ ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں محمد قلی کو جو شہرت حاصل تھی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

محمد قلی فرزند اس راج کا — کہ لائق ہے وہ تخت ہور تاج کا
کیس تے سو یک خوب ہیں سندریاں — دیوانی ہیں اس کی سو حور و پریاں
جو کچھ نور شہ مکھ چندر میں آہے — نہ جن ناپری نہ بشر میں آہے
پریاں شاہ کے عشق کی پا امنگ — پڑیں شہ اوپر شمع پر جوں پتنگ
لگا عشق لاکھ استریاں لاکھ دھات — دیوانی ہو پھرتی ہیں اس کے سنگات
جہاں پاؤں دھر شاہ چلتا آہے — وہاں آب زمزم اُبلتا آہے

ملا وجہی کے بعد گولکنڈے کا سب سے بڑا اردو شاعر خود محمد قلی قطب شاہ تھا۔ یہ موسیقی، رقاصی، شاعری اور مصوری غرض جملہ فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اور اسی لئے اس کے دربار میں دور دور کے ہندو مسلمان علماء و فضلاء اور بنارس کے برہمن بھی جمع ہو گئے تھے۔

ان لوگوں کی زبان پر برج بھاشا کا اثر پڑ چکا تھا اور وہ جب دکن آئے تو اپنے ساتھ وہ اثر بھی لیتے آئے۔ اسی وجہ سے اس دور کی اردو میں صرف الفاظ کی حد تک برج بھاشا کی کچھ شکلیں نظر سے گذرتی ہیں لیکن زبان کا پورا ڈھانچہ اور دوسری خصوصیات پنجابی

پراکرت ہی کی باقی رہیں۔ اور انہی کی وجہ سے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ قطب شاہیوں کے زمانے کی زبان اردو نہیں بلکہ ہندی ہے لیکن یہ غلط فہمی اور معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں وہ زبان تو عالم وجود ہی میں نہ آئی تھی۔ جسے آجکل ہندی کہتے ہیں۔ البتہ شمالی ہند میں اس وقت برج بھاشا کا دور دورہ تھا اور اسی کے الفاظ اس وقت کی اردو تحریروں میں نظر سے گذرتے ہیں۔ ہندی دراصل فورٹ ولیم کالج کے بعد کی پیداوار ہے۔ اور اردو ہی کی ایک شکل ہے جو ناگری حروف کے روپ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا وہ برج بھاشا میں تھا۔ برج بھاشا اور ہندی و اردو میں بہت بڑا فرق ہے۔ انکے درمیان اساسی فرق دو قسم کے ہیں۔ یعنی افعال کے آخری اجزا کے۔ اور عام لفظوں کی شکلوں کے۔ مثلاً برج بھاشا میں افعال کے آخر میں تا۔ تے۔ تی نہیں۔ بلکہ اے اور او آتا ہے۔ مثلاً اردو افعال کھاتا ہے کھاتے ہو اور کھاتی ہے کی جگہ برج بھاشا میں کھاوے ہے۔ کھاؤ ہو اور کھائی ہے مستعمل ہے۔ اور افعال کی یہ شکل قطب شاہی دور کی اردو میں نظر سے نہیں گزرتی۔ جو لوگ برج بھاشا کے علاقہ میں رہ پڑے ان کے یہاں اس کی چند مثالیں مل جاتی ہیں مثلاً میر تقی میر نے لکھا ہے:۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

اس شعر میں میر نے پوچھتے ہو کی جگہ برج بھاشا کا فعل پوچھو ہو لکھا ہے۔ اسی طرح غالب کے یہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے:۔

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب

آتا ہے کی جگہ غالب نے برج بھاشا کا فعل آئے ہے لکھ دیا ہے۔

اردو یا ہندی اور برج بھاشا کا دوسرا فرق یہ ہے کہ سنسکرت کے جو لفظ اردو یا ہندی میں مشدد حروف صحیح اور مختصر حرف علت کے ساتھ مستعمل ہیں برج بھاشا میں وہی الفاظ طویل حرف علت اور سادہ حرف صحیح کے ساتھ رائج ہوئے۔ مثلاً ہندی یا اردو کا پتہ اور مٹی وغیرہ برج بھاشا میں پات اور ماٹی کی صورت میں جلوہ گر ہیں لیکن قطب شاہی عہد کی اردو میں ہر جگہ پتہ اور مٹی جیسے الفاظ کی شکلیں نظر سے گزرتی ہیں۔ مثلاً مانگ اور مانگنا کی جگہ اس عہد میں منگ اور منگنا مستعمل تھا۔ محمد قلی کا ایک شعر ہے:۔

دلا منگ خدا کن کہ خدا کام دیوے گا تیرے من کے مراداں کے بھرے جام دیوے گا

قطب شاہی دور کی اردو کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی۔ کہ اس زمانے میں فعل فاعل کے لحاظ سے لایا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف آجکل کی اردو میں فعل مفعول کے لحاظ سے لایا جاتا ہے۔ مثلاً قطب شاہی عہد میں کہتے تھے۔ لڑکا روٹی کھایا۔ اور اسی زمانے میں شمال کی اردو میں فعل کو روٹی یعنی مفعول کے لحاظ سے مونث بنا کر کہتے تھے۔ لڑکے نے روٹی کھائی۔ یہ اتنا اہم فرق ہے۔ کہ اس کی وجہ سے قطب شاہی اُردو بالکل علیحدہ نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر محمد قلی کا یہ شعر پیش ہے:۔

جو کوئی کہتا ہیں جام لیتا سلطانی جم مدام کیتا

دوسرے مصرعہ میں آجکل کی اُردو کے مطابق سلطانی جم مدام کی ہونا چاہئے۔ کیونکہ سلطانی مونث ہے۔ اور فعل مونث کے لحاظ سے عام اردو میں لایا جاتا ہے۔

ملا وجہی جو قطب شاہی عہد کے بہت بڑے شاعر اور نثر نگار ہیں۔ انہوں نے عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں اردو نثر میں ایک کتاب سب رس لکھی تھی جس میں استعارے کے پیرائے میں حسن وعشق کا ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب کی نسبت جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے اُن سے اس عہد کی زبان کی نوعیت اور قوت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"اگر کسی میں سخن شناسی ہور اسرار دانی ہے تو یو کتاب گنج العرش بحر المعانی ہے۔ جیتا کوئی طبیعت کے کواڑ کھولے گا۔ اس کتاب میں نین سو بات کیا بولے گا۔ جو کچھ آسمان ہور زمین میں ہے۔ سو اس کتاب میں ہے۔ جو کچھ دنیا ہور دین میں ہے سو اس کتاب میں ہے۔ ہر گز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نہیں کیا اس دھات بات کون سلامت نین دیا۔"

اسی طرح آگے چل کر لکھتے ہیں:—

"غرض بہت نادر نادر باتاں بولیا ہوں دریا ہو کر موتیاں رولیا ہوں۔ اس دریا میں غوطہ کھائیں گے۔ تو جاگا جاگا کے غواصان موتیاں پائیں گے۔ فرہاد ہو کر دونوں جہان تے آزاد ہو کر دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اُلٹایا تو یو شیریں پایا۔"

اس نثر کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کی ایک نظم پریم کی کہانی بھی سننے کے قابل ہے۔ جس میں وہ ایک محبت کی ماری عورت کی زبان سے کہتا ہے:۔

سنو لوگ میری پرم کی کہانی　　کہ پیلا ہے رنگ عاشقی کی نشانی
محبت کی لذت فرشتیاں کوں نین ہے　　بہت سعی سوں میں یہ لذت پچھانی
جو کوئی عمر کھویا ہے ساجن ہوس میں　　جیون پھل وہی پائیا کر میں جانی
اسی کا ہے وو جگ میں جیونا انند سوں　　جنے نیہ بوجھیا ہے سُن اے ایانی
نبی صدقے قطبا جگت مول پایا　　سو وہ عشق ہے اس سے نین خوش کہانی

یہ تو قطب شاہی عہد کے بہت بڑے شاعر اور عظیم الشان بادشاہ کا کلام تھا۔ اس دور کا آخری فرمانروا سلطان ابو الحسن تانا شاہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح شعر و سخن سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے زمانے تک مغلوں کے اثر سے دکن کی اُردو میں فارسی کا عنصر زیادہ ہو گیا تھا جس کا ثبوت اس کی اس غزل سے ملے گا:—

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ　　جیوں گل شگفتہ ہو کو میری انجمن میں آ
کب تک رہے گا جیوں لبِ تصویر بے سخن　　اے شوخ خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ
چاہتا ہوں وصفِ قد میں کروں فکر شعر کی　　اے معنیٔ بلند شتابی سوں من میں آ
اے جانِ بو الحسن تو اچھے خوش لٹک ستے　　بندِ قبا کوں کھول کے صحنِ چمن میں آ

بقیہ "وہ کو کی کوئل"

ارتھی کی چادر کی طرح تمہارے گرد کیوں لپٹا جا رہا ہے۔ یہ گجروں سے سجی ہوئی کار تمہارے دروازے پر آ کر کیوں کھڑی ہو گئی ہے۔ یہ تمہیں کس نے اُٹھایا —— آہ یہ تمہاری سسکیاں، چپ ہو جاؤ میری ہمراز۔ میری غمگسار۔ میری مظلوم رفیقہ۔ دیکھو آم کی منجریاں پھوٹ آئی ہیں اور کوئل کا راگ جاگ اُٹھا ہے۔ دیکھو، سنو وہ کو کی کوئل —— آہ میرے سر میں میخیں ٹھوک دو۔ درد کی کیلیں گاڑ دو —— اب کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ سڑک پر صرف دھول رہ گئی —— خم بہ خم —— پیچ در پیچ!

(چوہدری برکت علی بی۔ اے ایڈیٹر۔ پرنٹر۔ پبلشر نے کوآپریٹو کیپیٹل پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لطیف لاہور سے شائع کیا۔)

شریف کنجاہی

گریز

شکست کھا بھی چکا اعتراف کر بھی چکا
مری بلند تمناؤں کے حسیں سپنے
کہ جاگ جاگ کے راتوں کو جو بُنے تھے کبھی
انہیں بکھیر چکا تار تار کر بھی چکا
اگر حیات عبارت ہے دل کے جینے سے
اگر حیات فقط سانس ہی کا نام نہیں
مری تلاش نہ کر، میں تو کب کا مر بھی چکا

منظر سلیم

جھلک

اور پھر لہر اُٹھی، دوڑ گئی، ساز بجے
سرمئی ہونٹوں پہ نوخیز کنول گانے لگے
جیسے فردوس کی فردوس فضا میں ناچے

کاش ایسے میں وہ آنسو بھی کنول بن جاتا
جو، ذرا پہلے ان آنکھوں کے کسی گوشے میں
اپنے ماحول کا آئینہ بنا بیٹھا تھا ــــ!

غلام ربانی تاباںؔ

فروزاں

رات دن
ایک افسانہ بُنے جاتے ہیں
مختلف باب مگر ایک پلاٹ
ــــ کبھی یونان کے غلاموں کی بغاوت کا سماں
کبھی پیرس کا کمیون
کبھی روسی مزدور ــــ
زار کا تختہ اُلٹنے کے لئے تیغ بکف
مختلف باب مگر ایک پلاٹ
وہی طبقات کی جنگ ــــ
ظالم و مظلوم کی جنگ
جس کی بُنیاد پہ قائم ہے نظامِ عالم

محمد خالد اور احمد ندیم

ایک سفرنامہ

ڈیپلو سے نوکوٹ تک

اُردو میں اُن سفرناموں کی افسوسناک کمی ہے جو ادبی نقطۂ نگاہ سے "سفری سوانح" کے تحت میں آسکیں۔ دراصل دورِ جدید میں ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں کو جنس اور انقلاب کے موضوعات نے کچھ اس شدت سے جکڑ رکھا ہے۔ کہ ادب کی دیگر مفید اور دلچسپ اصناف کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں رہی اور اگر ہو بھی تو یہ خوف ان کی اشاعت میں حائل ہوتا ہے۔ کہ یہ موضوع مروجہ اور "الٹرا ماڈرن" موضوعات سے مختلف ہے۔ اس لئے ادبی رسائل کے ایڈیٹر اسے مشکل سے قبول کریں گے۔

"ادب لطیف" پہلی مرتبہ دو نوجوان دوستوں کے ایک مختصر سے سفر کی کیفیت پیش کر رہا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے کئی طباع اور ذہین نوجوانوں کے لئے یہ دلآویز سفرنامہ ایک شاہراہ ثابت ہوگا جس پر چلکر وہ اردو ادب کو مالا مال کر دینگے۔ غیر زبانوں کی تنقیدی کتابیں پڑھ کر شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کو تمغے تقسیم کرتے پھرنے سے کہیں بہتر ہے، کہ وہ کوئی تعمیری کام کریں اور ادب کے گلزاروں پر پتھر پھینکنے کے بجائے زندگی کے مرغزاروں کی وسعت اور صباحت اپنی تحریروں میں سمو دیں۔

"ڈیپلو سے نوکوٹ تک" صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر (دھر) میں ایک گاؤں ڈیپلو اور ایک ریلوے اسٹیشن نوکوٹ کے درمیان ایک سفر کی روداد ہے، یہ سفر ستمبر ۱۹۴۵ء میں کیا گیا تھا۔ لکھنے والے جذباتی ہم آہنگی کے مدنظر صیغۂ واحد استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

ایڈیٹر

جب میں ڈاکٹر کو الوداع کہنے کے بعد لوٹا۔ تو دونوں ساربان اونٹوں کی مہاریں تھامے دروازے کے باہر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے سورج ابھی ریت کے ٹیلوں سے نیزہ بھر اونچا تھا۔ مگر ویرجی کا مشورہ تھا۔ کہ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہئیے۔ سو ایک ساربان کو اونٹ پر پاکھڑا ڈالنے کے لئے کہا گیا۔ ویرجی نے (جو ایک پیدائشی شتر سوار ہیں) میری کتابیں ایک چادر میں دو برابر گٹھڑیوں میں اس طرح باندھ رکھی تھیں کہ متوازن صورت میں اونٹ پر بآسانی دھری جاسکیں۔ اُنہوں نے شام کا کھانا جو روٹیوں اور گھی میں تلے ہوئے انڈوں پر مشتمل تھا۔ پہلے سے اخباروں میں لپیٹ رکھا تھا اور اس پر بندھے ہوئے رنگین فیتے نے تو اسے اچھا خاصا نفیس بنڈل بنا دیا تھا۔ اس بنڈل کو نہایت محنت اور چابکدستی اور انگوٹھوں کے دباؤ سے حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ اور جب یہ کوشش ناکام ہوتی نظر آئی تو اسے نہایت بھونڈے طریق پر ٹھونس دیا گیا۔ (انسان کے دماغ میں نفاست اور بھاشتنا پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس لئے نفیس بنڈل کو حجامت کے تھیلے میں ڈالنے کے بجائے ٹھونسنے پر مجھے ملعون نہیں کیا جاسکتا) یہ حجامت کا تھیلا سچ مچ عمر عیار کی زنبیل ہے۔ اس میں اتنی چیزیں سما سکتی ہیں کہ آپ اُن کا تصور تک نہیں کر سکیں گے۔ اور جب یہ بالکل بھر جائے۔ اور ہمارے کرّے کی سی صورت اختیار کرلے تب بھی اس میں کئی ایک چیزوں کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس تھیلے کو ہم نے پاکھڑے کی گھنڈی سے لٹکا دیا۔ ساربان اندر سے میرا ہولڈال اُٹھا لایا۔ ویرجی اور ساربان نے ملکر اسے پاکھڑے پر کچھ اس طرح بچھا دیا۔ کہ میرے اور ساربان کے لئے دو نہایت ملائم اور آرام دہ نشستیں بن گئیں۔ یہ اطمینان کر کے کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ میں ویرجی کو آخری ہدایات دے کر اپنی نشست پر آبیٹھا۔ ویرجی کے لئے میرا رواں رواں شکر گزار تھا۔ اچھا آدمی۔ وہ میرے لئے اتنا ہی مددگار اور کارآمد ثابت ہوا تھا۔ جتنا مسٹر ووسٹر کے لئے مسٹر جیوز (Jeeves) میرے قیام کے دوران میں سوائے الہ دین کے چراغ کے وہ میرے لئے سب کچھ مہیا کرتا رہا تھا اور

فی الواقع ڈپلو میں، وہ میرے لئے لازمی اور ناگزیر اور جانے کیا کیا ہوگیا تھا۔

ساربان اپنی نشست پر آیا تو اونٹ حسبِ معمول چند بے تکے زاویئے بنا کر اُٹھا۔ میں اب بہت بلند ہوچکا تھا دیہاتی مکانوں کی منڈیروں کے برابر، میں نے فیلٹ چھو کر دیرجی کو اور ایک مبہم طریق پر ڈپلو کو الوداع کہا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ڈپلو اور اُس کے اچھے لوگ ہمارے عقب میں تھے۔ اور ہمارے سامنے حواس باختہ سورج کی زردی اور لالی کا عجیب سا امتزاج —— جیسے آگ بھڑک رہی ہے —— جیسے آگ بجھ رہی ہے!

وہی مینگنیوں اور گوبر سے پٹی ہوئی ریتلی چراگاہ، ٹیلوں پر جگالی کرتی ہوئی بکریاں۔ کنوئیں میں سے پانی کھینچتی ہوئی تین عورتیں جو دور سے چڑیلیں معلوم ہوتی تھیں۔ ہیڈ منشی (ہمارے ہاں اسے نائب تحصیلدار کہتے ہیں) ننگے سر اور ننگے پاؤں۔ ہاتھ میں رسی لئے اپنی گائے کے پیچھے بھاگتا ہوا اور اپنی "ہیڈ منشی شپ" کے آداب اور مصلحتوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا۔ دور اسکول کے لڑکے فٹ بال کھیلتے ہوئے (فٹ بال کی آواز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ اسکے اندر ہوا فولادی پمپ کے بجائے انسانی پھیپھڑوں کی مرہونِ منت ہے) مسٹر وبر توانی ہیڈ ماسٹر۔ وہی ٹھنگنا گھبرایا ہوا بدحواس آدمی —— اپنے الگ تھلگ مکان کے سامنے والی گلی میں کھڑا مجھے ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتا ہوا۔ یا شاید مجھے یاد دلاتا ہوا کہ میں پلٹتے وقت اُس کیلئے نارنگیاں لانا نہ بھول جاؤں —— یہ تھے ڈپلو کے آخری نقوش۔

اسکے بعد میں تھا، اور میرا ساربان —— اور وہ جنگلی بوٹیوں اور خودرو جھاڑیوں میں سے لہراتا ہوا ریتلا راستہ جو سامنے ریت کی ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا —— ڈاکٹر اور میں اس پہاڑی کی چوٹی تک کئی مرتبہ آئے تھے۔ اسی پہاڑی پر سے میں نے پہلی بار ڈپلو کو نیچے نشیب میں ایک کھوئے ہوئے رومان کے شہر کی صورت میں دیکھا تھا۔ اب بھی ڈپلو سنہری شام کے شامیانے تلے بالکل مطمئن اور بے پرواہ انداز میں پڑا تھا —— ڈپلو کو میری جدائی کا چنداں احساس نہ تھا —— پھر اونٹ ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا اور ڈپلو میری نظروں سے غائب ہوگیا۔

منظر انتہائی دلکش تھا اور ایک انوکھے صحرائی حسن کا حامل۔ جنگل کی خودرو جھاڑیوں سے ڈھنپی ہوئی ریتلی وادیاں اور پہاڑیاں جو بالکل اصلی وادیوں اور پہاڑیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں عجیب سے ٹیڑھے ٹیڑھے اکیلے اکیلے سے درخت بھی تھے —— کاش میں آپ کو سب بوٹیوں اور درختوں کے نام بتا سکتا۔ مگر میں علم الطبیعات کا ماہر نہیں ہوں۔

کبھی کبھی ہمیں موروں کی جھنکار سنائی دے جاتی ایک دو مرتبہ تو ساربان نے اشارے سے مجھے مور دکھائے بھی۔ جو قدرت کے اس جنگلی باغ میں غرور سے اپنے رنگین پروں کی بھڑک دکھا رہے تھے۔ اور مورنیاں اُنکے سامنے کھڑی تھیں مسحور اور اداس اور شاید منتظر بھی۔ (کیونکہ ناچتے ہوئے مور کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکتا ہے۔ جسے مورنی چُگ لیتی ہے۔ اور یہی آنسو مورنی کے پیٹ میں انڈے کی تعمیر کی بنیاد ثابت ہوتا ہے —— آنسو اور نسل کشی! عجیب سی بات ہے۔ مگر کھلنڈری قدرت جو انسانی ڈھانچے کی خاکستر سے پھول اُگا سکتی ہے۔ اگر آنسو میں سے انڈا پیدا کرلے، تو حیرت بیکار ہے!) —— پھر فاختہ کی آواز آئی جو اس گلابی جھٹپٹے میں نیم خوابیدہ پہاڑیوں اور درختوں اور جھاڑیوں کو اپنا ایک ہی ابدی پیغام سنائے جارہی تھی —— کوکوکو —— مترنم آوازوں کی لہریں تھیں جو فضا میں آن کی آن میں لپک جاتی تھیں۔ کھنکھناتی ہوئی صداؤں کے چھینٹے تھے جو اندھیرے اجالے کی حدوں کو بھگوئے دے رہے تھے —— کوکوکو —— پنجاب میں جہاں ہم فاختہ کو گھگھی کہتے ہیں ایک عجیب سی لیکن بڑی خوبصورت کہانی مشہور ہے —— بزرگ کہا کرتے تھے کہ گھگھی کہتی ہے۔ "یوسف کھوہ۔ یوسف کھوہ" —— جب حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈالدیا تو یہی گھگھی تھی جو اُن کے بوڑھے والد حضرت یعقوبؑ کے پاس یہ پیغام لے کر آئی تھی —— "یوسف کھوہ یوسف کھوہ" —— یوسف کنوئیں میں ہے۔ یوسف کنوئیں میں ہے! —— خدا جنت

نصیب کرے ہمارے صدیوں کے پرانے افسانہ نگار کو جس کی تخیلہ نے گھگھی کو کاشف الاسرار بنا دیا!

اونٹ کی چال ریاضی کے "سائن کرو" کے نچلے حصے سے کچھ نہ کچھ مشابہت رکھتی ہے، پہلے آپ نیچے جاتے ہیں۔ اور پھر اچانک نہیں بلکہ ایک متوازن گھماؤ کے ساتھ اوپر اُٹھ جاتے ہیں اور اوپر اُٹھتے ہی پھر نیچے چلے آتے ہیں —— جیسے سمندر کی لہروں پر —— لیکن میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنا خوش نہیں تھا۔ ایک تو نشست تنگ تھی۔ دوسرے وہ کتابوں کی گٹھڑیاں جنہیں ویرجی نے میرے آگے پاکھڑے پر رکھا تھا۔ بار بار میرے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں۔ شروع میں تو یہ کتابیں میرے گھٹنوں کو سہلاتی رہیں۔ پھر چٹکیاں لینے لگیں۔ اور اب لوہے کی سلاخ کی طرح انہیں چھیدے جا رہی تھیں۔

ڈپلو سے نوکوٹ تک کا راستہ انہی ریتیلی پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ ہے —— چڑھاؤ اور اُتار۔ اتار اور چڑھاؤ، بالکل اونٹ کی چال کی طرح —— بالکل سمندر کی لہروں کی طرح۔ عین مین سلسلۂ خیالات کی طرح —— ان پہاڑیوں کے درمیان ترائیوں میں کہیں کہیں باجرے کے کھیت اور "منیاں" ہیں، جن میں "چھائیاں" بافراط ہوتی ہیں۔ تھر میں ہندوانہ یا تربوز کو چھائی کہتے ہیں۔ چھائی تھر کی بہشت کا اکلوتا پھل ہے۔ اس لئے اسے نہایت شوق اور قدرے تعظیم اور احترام سے کھایا جاتا ہے، چھائیوں اور ایک دو اور سبزیوں کی پیدائش کا یہی موسم ہے —— چھائیوں کے موسم سے چند مہینے پہلے لوگ ایک دوسرے سے اُن حسین اور خوش آئند گھڑیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ جب پھیکی چھائیوں کی کثرت ہوگی، یہ احترام اور انتظار ایسے ملک میں عین فطری ہے۔ جہاں سارے سال اور کوئی پھل یا سبزی نہ اُگتی ہو۔

اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ تو میں آپ کو ڈپلو سے نوکوٹ تک اونٹ پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سورج غروب ہوتے ہی اس سفر میں ابدیت رچنے لگتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہ ہوگا ریت کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں اور مسافر یوں محسوس کرتا ہے۔ جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفر نہیں۔ یہ سفر ایک پرانے مریض کی زندگانی سے بھی زیادہ طولانی ہے۔

رفتہ رفتہ مغربی افق بچے کھچے گلاب کی تلچھٹ پی گیا۔ اور درختوں اور جھاڑیوں پر رات کی سیاہی یعنی ابدیت کی کہر چھانے لگی فاختہ چپ ہوگئی، اُس کے نغموں کی جگہ جھینگروں اور "حشرات شبی" کی مسلسل تیز اور زیر و بم سے بے نیاز پکاروں نے لے لی۔ البتہ کبھی کبھی کسی شب زندہ دار پرندے کی اداس "تو ہو" سنائی دے جاتی تھی۔ خوش قسمتی سے یہ ایک چاندنی رات تھی، تیرھویں کا بڑا اور برف جیسا سفید چاند صاف آسمان پر پوری شان سے چمک رہا تھا۔ ہر جھاڑی اور بوٹی دمکنے اور ٹمٹمانے لگی تھی۔ اور گرد کی پہاڑیاں چاندنی میں سحر زدہ کھڑی تھیں، ہمارا راستہ جھاڑیوں میں سے سفید جھلکی مارتا ہوا رینگ رہا تھا۔ جنگل کی رات کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ہمیں کبھی کبھی نیچے کسی گوٹ میں مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹ سنائی دے جاتی۔ جو ہمیں بتاتی کہ ہم انسانی آبادی سے دور نہیں —— بعض اوقات تو ہم لوگوں کے ہنسنے بولنے اور بھاگنے کی آوازیں بھی سُن لیتے تھے۔

یہ طلسم جو چاندنی جنگل اور درختوں پر پھونکتی ہے، صرف ایک بہت بڑے ساحر کا کام ہے، درخت عجیب خیالی صورتوں میں بدل جاتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ عظیم آسمان کو چھوتے ہوئے دیو بن جاتے ہیں۔ اور کئی مرتبہ دبک کر ادھر ادھر پھیل جاتے ہیں میں نے ایک درخت دیکھا۔ جو اُس وقت ایک بہت بڑا بادبانی جہاز بنا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنے تمام بادبان پھیلائے کسی جزیرے میں مدفون خزانے کی دھن میں روانہ ہونے کو تیار کھڑا ہو —— ایک درخت جو ہوائی چکی کا روپ دھارے تھا، میرے غور سے دیکھنے سے فوراً اپنی اصلی شکل میں آگیا —— اور وہ ایک بڑا اور مہیب ٹینک جو میرے نزدیک آنے پر کیکر میں بدل گیا،

کئی دفعہ یہ جھاڑیاں اور ان میں لہراتے ہوئے یہ ریتیلے راستے مدہم روشنی اور سائے اور سکوت، سب ملکر ایک مبہم سا کھویا کھویا مگر بہت بڑا افسانوی شہر بن جاتے ہیں۔ میناروں۔ گنبدوں اور محرابوں

والا شہر ـــــ میں نے راستے میں ایسے ہی دو تین شہر دیکھے، اور اگرچہ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ میرے ذہنی فریب تھے۔ جو جنگل اور چاندنی اور سکوت کی باہم سازش کا نتیجہ تھے۔ مگر میں اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اصلی شہر نہیں تھے!

ایک مرتبہ میں نے جنگل میں ایک تیز سیٹی کی آواز سنی، ـــــ ریل کی سیٹی کی آواز ـــــ میں جانتا تھا کہ ریل یہاں سے تین پینتیس میل دور ہے۔ اور اگر یہ آواز ایک بار بلند ہو کر رک جاتی تو میں یہی کہہ کر اپنے اوسانوں کو بہلا لیتا، کہ میرے کان گونجتے ہیں۔ یا رات کے کسی پرندے نے چہل کی ہے، مگر میں نے سیٹی کے بعد گاڑی کی مدھم چھکا چھکا چھک چھک بھی سنی۔ اور پہیوں کی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی جیسے کوئی گاڑی اچانک حرکت میں آگئی ہو۔ یقیناً یہ کوئی نظر نہ آنے والی آسیبی گاڑی تھی، جو ان جنگلوں میں سے گزر کر بھوتوں کے کسی شہر کو جا رہی تھی۔ ذرا اس ریل گاڑی کا تصور کیجئے، جس کے ڈرائیور سے لے کر گارڈ اور مسافروں تک سب جُھنتنے ہوں ـــــ جھتنے اور جھتنیاں ـــــ جگنوؤں کے دیئے اور خشک تربوزوں کے اٹیچی کیس اور کیلے کے پتوں کے بستر، اور ـــــ ہائے یہ چاندنی کا جادو، اور یہ انسان کی قوتِ خیال جو الف لیلہ کی تصنیف کا باعث بنی!

رات کے ساتھ چاند کی کرنوں کا سحر بھی بڑھتا گیا، چاند کے کھلنڈرے ساتھی ستارے بھی جیسے ہچکچاتے اور شرماتے ہوئے اپنی سلیٹی پناہ گاہوں سے باہر آ گئے۔ شروع شب میں ایک گھڑ سوار اور ایک شتر سوار ہمیں راستہ میں ملے تھے، مگر اب تین چار گھنٹوں کے طویل وقفے اور طویل تر مسافت کے دوران میں ہمیں راہ میں کوئی ذی روح نہ ملا۔ اگرچہ مویشیوں کی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں ہمیں اپنے ہم جنسوں کی قربت کا احساس دلاتی رہیں۔ میں ساربان کی زبان اور ساربان میری زبان سے نا آشنا تھا۔ اس لئے گفتگو کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوتی تھی، اور ایک آدھ سندھی فقرے (مثلاً فلاں بانو سٹھو ہے) سے شروع ہو کر ختم ہو جاتی تھی۔ ساربان پوچھتا "صوبہ دار سٹھو مانو ہے"؟ ـــــ یعنی کیا صوبہ دار اچھا آدمی ہے؟ اور میں جواب دیتا "صوبہ دار سٹھو مانو ہے"۔ ساربان کے لہجے سے میں اس کا مافی الضمیر کسی حد تک سمجھ لیتا تھا۔ مگر یہ "قوت" تبادلۂ خیالات میں ممد ثابت نہ ہو سکی۔ گفتگو کی تمام کوششوں کو بے بسی کے کنگارے سے نیچے اجنبیت کی کھاڑیوں میں گرتے دیکھ کر ساربان شاید بالکل نا امید ہو گیا۔ اور ایک عجیب چیختی ہوئی پھٹی پھٹی غیر قدرتی آواز میں گانا شروع کر دیا۔ اور اپنی ناک کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت میں لیکر اس سے وہی کام لینے لگا جو گوّیئے طنبورے سے لیتے ہیں، اور سچ مچ اس کی ناک کی "تنغ تنغ" کسے ہوئے تاروں والے ساز کی طرح مہین اور تیز تھی۔

یہ کافی بے سرا گیت تھا۔ سفر سے اکتاہٹ اور آسیبی سکوت کے شدید احساس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا، کہ اس گیت کو جاری رکھا جائے، میں سوچ رہا تھا، کہ آخر اس گیت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، کیا کسی نوجوان دیہاتی کے عشق کا گیت ہے، کیا یہ کوئی رزمیہ نغمہ ہے۔ اور "یہ مٹھو گھوڑا" کون ہے۔ اور بار بار اس سے کیا درخواست کی جا رہی ہے، ـــــ کاش اسوقت ورجی ہوتے ـــــ وہ امرت دھارا قسم کے انسان جو شیکسپیر کا سن پیدائش اور شلغم کے کیمیاوی اجزا ایک سانس میں بتا سکتے تھے!

شاید "مٹھو گھوڑا" بہت اڑیل ثابت ہوا، اور ان تمام شاعرانہ درخواستوں کو پی گیا۔ جو ساربان نے اسکے حضور گزرانی تھیں، مٹھو گھوڑے کی بے اعتنائی سے تنگ آ کر ساربان نے ایک اور گیت شروع کیا۔ جو اگرچہ اُسی تیز و تند "تنغ تنغ" کی دھن پر اور اُسی ٹین کے کنستر کی سی آواز میں گایا گیا، مگر میرے خیال میں مٹھو گھوڑے کے گیت سے زیادہ معقول اور بامعنی تھا،

جلد ہی وہ اس گیت سے بھی تھک گیا۔ اور پھر ایک، وقفہ آیا۔ جو بقا کی طرح لمبا اور کائنات کی طرح وسیع تھا اور جو چاندنی اور جنگل کی سائیں سائیں سے لبریز تھا، ہم چپ چاپ سفر کرتے رہے۔ ہم ایک مہتاب زدہ ٹیلے پر چڑھتے، اور نیچے ایک ترائی کے انجام پر ایک اور مہتاب زدہ ٹیلا ہمارا منتظر ہوتا۔ کتابوں کی گٹھڑیوں نے میرے گھٹنوں کا اپریشن کر ڈالا تھا۔ ایک بار ساربان نے مجھ سے پوچھا "آرام سے بیٹھے ہو سائیں"؟ ـــــ میں نے اُس سے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں کتابوں کی مسلسل نوازشوں کی شکایت کی، جسے وہ شاید سمجھ نہ سکا۔ یا میری شکایت کو اس نے اہمیت ہی نہ دی، وہ یہ کیسے محسوس کر سکتا تھا بے چارا

کہ کتابوں ایسی بے مزہ چیزیں بھی کبھی کبھی انسان کا جینا اجیرن کر سکتی ہیں۔

ہم ایک جوہڑ کے پاس سے گزرے۔ جو چاندنی میں مدہم شیشے کی نکون معلوم ہو رہا تھا۔ ساربان نے جوہڑ کی طرف عجیب آرزو مندانہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ اس کے کنارے بیٹھ کر کھانا اور کچھ دیر آرام کرنا نہایت موزوں رہے گا۔ اونٹ کی رفتار بھی مدھم ہو گئی۔ مگر مجھے ابھی کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ کتابوں کی گٹھڑیوں کی مسلسل چاندماری اور ٹانگوں کے اینٹھ جانے کے باوجود میں چاہتا تھا۔ کہ منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کیا جائے، ساربان نے اپنی سست رفتاری کا جواب میری خاموشی میں پا لیا۔ اور مہار تھام کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بڑے گوٹھ کے قریب سے گزرے۔ یہیں بہت سی گھنٹیوں۔ باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھے گمان سا ہوا۔ کہ سامنے ایک گوٹھ موجود ہے۔ مگر وہ گوٹھ جو میں نے دیکھا۔ سراب سا تھا۔ چاندنی اور ریت کا ایک فریب جس کا ذکر پہلے کر آیا ہوں۔ یہاں ایک اونچے ریتیلے ٹیلے پر جہاں وراہی آسمان کی طرف رُخ کئے مُردوں کی طرح بے ہوش پڑے سو رہے تھے۔ میرے ساربان نے "شوشو" کر کے اونٹ کو بٹھا دیا۔ اگرچہ اس نے میری رضامندی ضروری نہیں سمجھی، میں مجبوراً اونٹ سے نیچے اتر آیا۔ کیونکہ بیٹھے ہوئے اونٹ پر بیٹھے رہنا عجیب بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں ریت پر چہل قدمی کرتا رہا۔ اور جب خون کی گردش اپنا معمول اختیار کر چکی، تو ان خوابیدہ مسافروں کے پاس ریتیلے فرش پر بیٹھ گیا۔ ساربان نے اونٹ کو دو چار ٹانڈے پیش کئے، اور حجامت کے تھیلے میں سے کھانے کا بنڈل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے ورچی یاد آ گئے اُنہوں نے کاغذوں اور فیتوں کی مدد سے اس پیکٹ کو ایک پیشہ ور مٹھائی فروش کی سی چابکدستی سے باندھا تھا ـــــ گھی میں تلی ہوئی روٹیاں اور انڈے۔ میں نے چھ روٹیاں اور نصف سالن ساربان کے حوالے کر دیا، اور اب میں اور میرا اونٹ والا دو پرانے ہجولیوں کی طرح اکٹھے بیٹھے کھانا کھانے لگے۔ اونٹ جو اب مجھے بہت ٹرانظر آ رہا تھا۔ اور راستے کے آر پار بیٹھا جگالی کر رہا تھا، اپنے دو انسان دوستوں کو مکمل بے اعتنائی سے دیکھ رہا تھا۔ ہم گھوڑوں کی طرح کھاتے رہے۔ کسی انسان کو کوئی کھانا اتنا لذیذ نہیں معلوم ہوا ہو گا۔ جتنا یہ دنیا کے بدترین باورچی کا تیار کردہ سالن اور موٹی موٹی روٹیاں ـــــ مگر یہ کھانا ہم نے ڈرائنگ روم کے تکلفات میں گھر کر کھایا تھا۔ خدا کے کھلے گھر کے کھلے آنگن میں ازلی ریت کی چاندنی پر بیٹھ کر اور دور گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹوں کو سنتے ہوئے ہم نے یہ دعوت اڑائی تھی،

میں نے ساربان کو دو اور روٹیاں دیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب اُسے کچھ اور دینے کی کوشش کی۔ تو اس نے انکار کر دیا، اب تین روٹیاں بچ رہی تھیں، اور میں سوچ رہا تھا۔ کہ ان کا کیا کیا جائے، آخر میں نے انہیں ساربان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اٹ" اور اونٹ کی طرف اشارہ کیا، میری تجویز یہ تھی۔ کہ اس دعوت میں اونٹ کو بھی حصہ دار بنانا چاہئے ساربان نے جواب میں "بس؟" کہا، مجھ سے روٹیاں لے لیں۔ اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا۔ کہ اس نے ان کا ایک گولا سا بنایا۔ اور انہیں خود ہی کھانے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں تینوں روٹیاں اُس کے مبارک پیٹ میں تھیں۔

اب سوال پیدا ہوا پانی کا۔ میں بہت پیاسا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سندھی میں میں نے کہا۔ "پانی وٹھے" ـــــ یعنی پانی چاہئے۔ اس نے جواب دیا "نہ۔ پانی نہ وٹھے، چھاہیوں وٹھے"۔ اور مبہم طریقے پہ نیچے اشارہ کیا۔ اس نے ایک لمبی تقریر کی، جس میں نیبوں اور چھاہیوں کے الفاظ بار بار آتے تھے، میرا ساربان ایک خوبصورت گھبرا ٹما لڑکا تھا۔ اس کی آواز رسیلی اور راگوں سے لبریز تھی۔ اور میں سوچنے لگا۔ کہ وہ اپنی اصلی آواز میں گانے کی بجائے اس باریک غیر قدرتی آواز میں گانا کیوں پسند کرتا ہے۔ حسن کی طرح موسیقی کے بھی کتنے بے شمار معیار ہیں۔

اس نے کہا "ہلو سائیں"۔ کھانے کے بعد وہ زیادہ مؤدب اور ممنون نظر آ رہا تھا۔ ہم اونٹ پر سوار ہوئے اور نیچے ترائی میں اتر گئے۔ ہمارے بائیں طرف ایک بستی تھی، ساربان اونٹ کو آہستہ آہستہ چلاتا۔ ایک طرف جھک کر، پھیلی ہوئی بیلوں اور باجرے میں کسی چھاہی کی تلاش میں تھا۔ ایک جگہ اُس نے اونٹ کو روک لیا۔

ہم دونوں نیچے اترے۔ وہ بنی میں گھُس گیا۔ اور بازوؤں اور کہنیوں تلے پانچ چھ بنیاں دبائے کچھ دیر بعد واپس آگیا۔ ہم دونوں وٹ (راستہ) پر بیٹھ گئے۔ اُسی طرح، گاؤں کے دو رفیقوں کی طرح۔ چھائیاں ہمارے سامنے تھیں، وہ اُن کو توڑ کر زمین پر رکھتا، اور میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھتا۔ ہم نے اُنہیں کھا کر اور اُن کا میٹھا اور ٹھنڈا رس چوس اور پی کر اپنی پیاس بجھائی۔

تھوڑی دُور جا کر ہم نے تیس پینتیس اونٹوں کے ایک قافلے کو جا لیا۔ مجھے اونٹوں کی وہ قطار کچھ عجیب سحر آمیز طریق پر علی بابا کی کہانی کے چالیس چوروں کی طرح معلوم ہوئی۔ اونٹ چمڑے کے بڑے بڑے مٹکوں سے لدے ہوئے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان میں گھی ہے۔ مگر مجھے یقین تھا۔ کہ ان میں گھی ایسی عام اور غیر رومانی پلپلی چیز نہیں ہو سکتی، گھی سے تو زیتون کا تیل زیادہ رومانی ہے میرے نزدیک تو ان مٹکوں میں خود چالیس چور ہی چھپے بیٹھے تھے۔ اور ان کا سردار تیل کے ایک سوداگر کے بھیس میں ان کو علی بابا کے گھر انتقام لینے کی خاطر مٹکوں میں چھپا کر لئے جا رہا تھا۔ ڈاکو —— یا نظر بظاہر ساربان بڑے خوش باش قسم کے بے فکرے معلوم ہوتے تھے، وہ اچھلتے ناچتے اور گاتے جا رہے تھے۔ میرا ساربان ان میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔ خاص کر ایک بکرے کی داڑھی والا پھرتیلا سا آدمی جو ایک چھلاوے کی طرح فریب دہ تھا۔ میرے ساربان کا کوئی گھرا لنگوٹیا نکلا۔ ساربان نے اس سے کئی باتیں کیں۔ پھر ہم قافلے سے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کسی کو اپنے سامنے ایک خرگوش کی طرح بھاگتے ایک بنی میں گھستے دیکھا۔ یہ وہی بکر داڑھی چھلاوہ تھا، وہ اب بنی میں جھکا چھائیاں اکٹھی کر رہا تھا۔ میرے ساربان نے بھی اس موقعہ کو غنیمت سمجھا، اور پھر ہماری پیاس بھی تو ابھی پوری طرح نہیں بجھی تھی۔ وہ بہت سی چھائیاں اکٹھی کر لایا۔ اور پھر سے دعوت اڑائی گئی۔ اسی اثنا میں چالیس چور ہم سے آگے نکل گئے۔ فارغ ہو کر ہم نے پھر قافلے کو جا لیا۔ اب کے ساربان نے شاید گپیں ہانکنے کے شوق میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ اور مجھے چالیس چوروں کی قطار میں شامل کر کے ساربانوں سے باتیں کرنے لگا، میں نے اُسے سختی سے حکم دیا۔ کہ وہ آگے نکل جائے۔ قافلے کو تو وہ میرے کہنے پر پیچھے چھوڑ آیا۔ مگر اب اُسکے انداز میں وہ چستی غائب تھی، صاف ظاہر تھا، کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف قافلے سے آگے نکلا ہے۔

کچھ دور جانے کے بعد ہم نے اس عجیب سی داڑھی والے شخص کو (جس کا نام عمر تھا) صرف ایک لنگوٹا کسے زمین پر چت، مردے کی مانند پڑا ہوا پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھوت کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا اور عجیب چہلیں کرتا ہمارے آگے آگے بھاگنے لگا۔ میں سوچنے لگا۔ کہ یہ عمر ایک نہایت کامیاب درباری مسخرا یا سینما کا میڈین ہو سکتا ہے آخر میرے "جلدی۔ جلدی" کی رٹ لگانے پر میرے ساربان نے بڑی بے دلی سے اپنے دوست عمر سے مفارقت گوارا کی، اور ہم قافلے سے بہت آگے نکل آئے، مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساربان نے اونٹ کو تیز چلانے اور نوکوٹ پہنچنے کے ارادہ کو فی الحال ملتوی کر رکھا ہے۔ اور دوسرے معاملات کے بارے میں سوچ رہا ہے وہ ممنونیت جو کھانا کھا لینے کے کچھ دیر بعد تک اس کے بشرے اور اس کی حرکات میں نمایاں رہی۔ غائب ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کئے جا رہا تھا، ایک گستاخانہ اطمینان سے (کم از کم مجھے یہ ایک گستاخی ہی نظر آئی) وہ اونٹ کے ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہُوا بنیوں کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بدمعاش! کیا اب تک چھائیاں اُس کے خیالوں میں بس رہی ہیں؟ کم از کم مجھے تو اب چھائیوں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، میں فوراً نوکوٹ پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ اونٹ کو باجرے کے ایک کھیت میں لے گیا۔ کھیت کے عین وسط میں اُسے بٹھا کر کہیں سے درانتی نکالی۔ اور کندھے پر پڑی چادر کو ہاتھ میں لیتا کھیت کے گنجان حصے میں گھُس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹانڈوں کا ایک بہت بڑا گٹھا باندھ لایا اور اونٹ کے سامنے ڈال دیا اونٹ نے اس انبار میں سے ایک ٹانڈا منتخب کر کے اسے کاغذ کے فیتے کھانے والے مداری کی طرح نگلنا شروع کیا۔ ساربان ایک مرتبہ پھر کھیت میں گھُسا، اور پہلے سے بھی بڑا گٹھا باندھ لایا۔ میرے دل میں ساربان کے خلاف ایک خاموش غصے کی آگ سلگ رہی تھی،

—— دیر کر رہا ہے۔ کمبخت، مگر ساتھ ہی میرے دل میں اس شخص کے لئے تحسین کے جذبات بھی تھے، قطع نظر اس بات کے، کہ باجرے کا کھیت اس کا نہیں تھا۔ اور رانڈوں کے یہ دو گٹھے قانون کے دو خبازے تھے، یہ شخص اپنے کام اور پیشہ میں مجھ سے زیادہ مستعد تھا۔ اور پھر اس کو اپنے جانور کا کتنا خیال تھا! اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اونٹ کو گالی بھی دیتا تھا خصوصاً اس وقت جب وہ چڑھائی پر جاتے جاتے اچانک رک کر اپنے لٹکے ہوئے ہونٹوں کو پھڑپھڑاتا۔ یا وٹ سے ہٹ کر بنیوں میں جانے کی کوشش کرتا۔ اس کی گالی کی لعنت لفظ "دلا" تک محدود تھی، اگر اس لفظ کا سندھی میں وہی مطلب ہے جو ہماری پنجابی میں ہے، تو اونٹ کے لئے یہ ایک عجیب سی گالی ہے، لیکن اگر گالی میں مہذب ہونے کی گنجائش ہے۔ تو یہ گالی پنجابی کی دوسری گالیوں کے مقابلے میں واقعی نرم اور مہذب تھی۔ اس گالی کے باوجود ساربان اپنے اونٹ کو اپنے بیٹے یا بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ عرب کی محبت اپنے گھوڑے سے، ایک تھری یا بلوچ کی محبت اپنے اونٹ سے —— یہ میری سمجھ میں آ سکتی ہے، ہم میں سے شاید کسی نے وہ مشہور انگریزی نظم "An Arab's Farewell to his Horse" نہیں پڑھی۔ اور اس سے متاثر نہیں ہوا، میں نے خود ایک آدمی کو (مگر صرف پردۂ سیمیں پر) کمال سنجیدگی سے اس بات کا اقرار کرتے سنا ہے کہ "گھوڑا میرا بہترین دوست ہے"۔

مجھے اعتراف ہے، کہ میں حیوانات سے رفاقت اور قرابت کا اتنا بلند بانگ دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ حیوانوں نے مجھ سے ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے، اور تین حیوانوں نے (جن میں ایک بلّا تھا اور دو گھوڑے) جن کی طرف میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا، میرے جذبات کی کوئی قدر نہ کی، انہوں نے کئی بار اپنے "قول فعل" سے مجھ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی، کہ اُن کو میری دوستی کا نہ کوئی پاس ہے نہ لحاظ ہے اور نہ ضرورت۔ کئی گھوڑوں نے تو فی الواقع میرے چمکارنے اور تھپکانے کے باوجود مجھے زمین پر پٹخ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے۔

حیوانات سے محبت، ایک راز ہے جو میں آج تک نہیں سمجھ سکا —— میرا مطلب محبت سے ہے، جو بعض لوگ اپنے کتے یا پالتو بن مانسوں یا لنگوروں سے کرتے ہیں، ہم سب نے خوبصورت کالروں میں "ملبوس" مغرور کتوں اور بالوں بھرے کتوروں کو موٹر کاروں کی پچھلی سیٹوں پر نہایت شان سے بیٹھے دیکھا ہے، اور شاید ہم سے اکثر کو اِن پر رشک بھی آ رہا ہوگا۔ ہم سب نے وہ عجیب بوڑھی میمیں بھی دیکھی ہیں، جو اپنے کتوں کی خوراک، صفائی اور آرام کا اتنا ہی خیال رکھتی ہیں، جتنا اپنی کوکھ کے بچوں کا —— شاید ان سے بھی زیادہ ——، یہی محبت میری سمجھ سے آج تک بالاتر ہے، میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ کم از کم میں اس نوع کی محبت کا نااہل ہوں، میرے خیال میں حیوانات سے اتنی شدید محبت کرنے والے بالکل کلبی اور زنگ چڑھے ہوتے ہیں، اور وہ اپنے ہمجنسوں سے اس درجہ بیزار ہوتے ہیں کہ انسان کی سوسائٹی پر کتوں کی سوسائٹی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ حیات کی حقیقتوں سے فرار کی یہ ایک نئی صورت ہے، جس کی طرف ابھی تک ہمارے رومان دشمن شعرا متوجہ نہیں ہوئے۔

حیوانات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں، اور میں حیوانات کو پالنے اور اُن پر ٹوٹے ہوئے صدیوں کے مظالم کی بیخ کنی کرنے والی مجالس کے اکثر اصولوں سے متفق ہوں۔ لیکن مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوگا کہ کسی کتے یا لنگور کو اپنے ساتھ لنچ یا ڈنر پر مدعو کروں۔ یا اُسے اپنے بستر میں سلاؤں۔ انہیں ناز برداریوں نے حیوانات کے دماغ بگاڑ رکھے ہیں۔ مجھے اب بھی پورا یقین نہیں، کہ ایک الٹرا ماڈرن میم صاحبہ کی اپنے کتے سے محبت انسان اور حیوان کے درمیان ایک understanding پر مبنی ہے، یا صرف رواج، فیشن اور خود نمائی کے جذبہ پر!

اب کئی لوگ ہیں۔ اور ان میں شاید بوڑھا شیکسپیئر بھی ہے، جو آپ کو بتائیں گے، کہ گھوڑا ایک شریف الطبع اور وفادار جانور ہے۔ گھوڑے کی عظمت کا یہ جہانگیر ہمہمہ دراصل انہیں ادیب لوگوں کی عبارت آرائیوں کا نتیجہ ہے، جو خود کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے، مجھے واللہ گھوڑے کی ذات سے کوئی پرخاش نہیں، مگر میں نے ان آنکھوں سے کئی گھوڑے دیکھے ہیں جن میں حلم اور وفا کا نام تک نہیں ہوتا۔ گھوڑ دوڑ

سے میرے مراسم دیرینہ اور فرسٹ ہینڈ ہیں یعنی میں نے خود گھوڑے کی سواری کی ہے، گھوڑوں کی تعریف کرنے والوں میں سے ایک شیکسپیئر ہی کو لیجئے، اس بیچارے کو تو کبھی گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق ہی نہیں ہوا، اس کی قسمت میں تو فقط گلوب تھیٹر کے باہر امراء کے گھوڑوں کی لگامیں تھامنا ہی لکھا تھا، ایسے شخص کو بھلا اس حیوان کی نفسیات اور خصائل کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ مسٹر ولیم شیکسپیئر کے بعد ہمارے دوست مسٹر جان گلپسن سے پوچھئے، جو ایک مغرور اور کاروباری شخص تھا۔ اور جسے ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پک نک پر جانا پڑا تھا۔

یہ مذاق نہیں میں کمال سنجیدگی سے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ یہ غلط خیال ہے کہ ایک کتا، یا ایک گھوڑا یا ایک بندر انسان کا انسان سے بہتر مونس و غمخوار ہو سکتا ہے، جو لوگ مویشیوں کی بریڈنگ اور سیوا کرتے ہیں، یا وہ جو مرغوں مرغیوں کی فارمنگ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد صرف مویشیوں اور مرغیوں ہی کی سوسائٹی کے لائق رہ جاتے ہیں، خود ڈلہوزی میں دو تین آدمی ایسے ہیں جن سے مجھے اور ڈاکٹر کو ایک مستقل شکایت ہے، ایک تو وہ ہیڈ منشی جن کا ذکر آچکا ہے، اور دوسرا پوسٹ ماسٹر، دونوں مویشیوں کے سرگرم "پالنہار" ہیں، ڈاکٹر انہیں ہمیشہ مذاقاً اور طنزاً Cattle Breeders کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ دونوں معقول انسانوں کی صحبت پر حیوانوں کی صحبت کو ترجیح دیتے ہیں، اور جب وہ اپنی گائے بھینس یا بکری کی صحبت میں ہوتے ہیں تو زیادہ خوش اور at home محسوس کرتے ہیں، جب وہ برہنہ سر برہنہ پا اپنی محبوباؤں کے پیچھے "لکھی لکھی" "ساوی ساوی" پکارتے ہوئے بھاگتے ہیں۔ تو ان کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی، ایک نئی روشنی آجاتی ہے —— یہی وہ لمحے ہیں جب وہ صحیح زندگی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں،

پھر بھی، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، میں بلوچ کی اپنے اونٹ سے محبت کو سمجھ سکتا ہوں۔ اور اتنی محبت کر بھی سکتا ہوں صحراؤں میں بھی مسافتیں، بے کنار تنہائیاں، جن سے ساربانوں کو دو چار ہونا پڑتا ہے انسان اور حیوان میں ایک جذبۂ رفاقت ایک Camaraderie پیدا کر دیتی ہیں، ساتھ ہی اونٹ غالباً اس بلوچ کی عزیز ترین متاع ہے وہ اپنے مالک کے لئے کماتا ہے، اس قسم کی محبت ایک قلندر کو اپنے بندر اور ایک مچھندر کو اپنے ریچھ سے ہو جاتی ہے، اور شاید بعض حیوانوں کی روحیں انسانوں سے زیادہ سچی اور بے داغ ہوتی ہیں، کیونکہ اگر ایک حیوان شکر گذار نہیں ہوتا، تو ہم کسی صورت میں اسے ناشکرا بھی نہیں کہہ سکتے" —— اور انسانوں کی اکثریت ناشکروں پر مشتمل ہے — ناشکر گذاری، جو بوڑھے شیکسپیئر کے الفاظ میں انسان کو سرما کی برفانی سانسوں کی طرح کاٹتی ہے، اور اسے انسانوں کو چھوڑ کر حیوانوں کی محبت تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

یہ معترضہ جملہ ڈلپ سے نوکوٹ تک کی مسافت اتنا طویل ہو گیا ہے ساربان نے گٹھوں کو اپنی نشست پر جمایا، اور پھر ان پر چڑھ بیٹھا۔ اور ہم نے اپنا سفر جاری کیا۔ گھنٹیوں اور انسانوں کی آواز نے ہمیں بتایا کہ اونٹوں کا قافلہ پھر ہم سے آگے نکل گیا ہے مگر اب ساربان اس قافلے کو جا لینے اور اپنے لنگڑے بیٹے عمر سے گپیں ہانکنے کا خیال چھوڑ چکا تھا، کچھ دور جا کر اس نے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اب ہمیں وٹ پر پڑاؤ ڈال دینا چاہئے، تاکہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے اس دوران میں اس کا اونٹ باجرہ چر لیگا۔ اور پھر ہم صبح ہونے سے پیشتر چل پڑینگے۔

لیکن وٹ پر کون سوئے! میں نے تو ڈلہوزی میں تہیہ کر لیا تھا کہ میں وٹ پر قطعی نہیں سوؤں گا، میں سانپوں سے ڈرتا ہوں، ہر صحیح الخیال انسان کو سانپوں سے ڈرنا چاہئے۔ مگر میری صحیح الخیالی ذرا شدید قسم کی ہے، اور ڈاکٹر نے بوقت روانگی مجھے خاص ہدایت کی تھی کہ تھر کا یہ صحرا صحیح معنوں میں سانپوں کی نگری ہے، ان سانپوں میں سب سے زیادہ دہشت ناک "ساہ پیوں" (سانس پی جانے والا) ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ رات کو سونے والے کی چارپائی پر چڑھ جاتا ہے۔ اور اس کی چھاتی پر رینگتا اپنا منہ اس کے ہونٹوں پر اس طرح رکھ دیتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے محبوب کا بوسہ لے، اس بوسے میں موت ہے"—— سانپ سونے والے کے منہ میں زہر ٹپکا دیتا ہے جس سے اس کے حلق کی رگیں کھچ جاتی ہیں اور اس کی سانس گھٹنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں، کچھ دیر کے بعد ہاتھ پیر شل ہو جاتے

ہیں اور زندگی گل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ سانپ دراصل فرضی اور خیالی ہے —— اس کا وجود افسانوی ہو یا حقیقی، اس کے طفیل تھر کے لوگ ایک مستقل دہشت اور خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور اگر چار پانچ آدمیوں کے مجمع میں ایک مرتبہ "سیاہ بیوی" کا ذکر چھڑ جائے تو بہت دیر تک گفتگو کا موضوع یہی سانپ رہے گا۔ اور اس کے متعلق کئی عجیب و غریب طوفانی اور اٹکل پچو کہانیاں سنائی جائیں گی۔

ڈاکٹر سے ملاقات سے قبل میں سمجھتا تھا کہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے ڈرنے والا انسان روئے زمین پر کوئی نہ ہوگا۔ میرے خوابوں کے بدترین کابوس وہ ہوتے تھے جن میں سانپ —— کوڑیالے دھبوں والے، بھورے اور نیلے سانپ —— میری طرف رینگتے ہوئے آتے تھے —— صرف رینگتے ہوئے۔ مجھے اب تک کوئی ایسا خواب یاد نہیں جس میں سانپ نے مجھے کاٹا ہو۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان بزدل آدمیوں میں سے ہوں جن کو خدا نے یہ کیڑا مارنے کی توفیق ودیعت نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر سے مل کر مجھے گونہ تسلی اور تسکین ہوئی۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے وحشت زدہ تھا۔ وہ کبھی رات کے وقت (خواہ وہ چاندنی رات ہی کیوں نہ ہو) ٹارچ کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ اس نے مجھے اپنے پیشرو ڈاکٹر کے متعلق بتایا کہ اگر رات کو اُسے کہیں باہر جانا ہوتا۔ تو شام سے صبح تک اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا۔ اور پانی پینے یا کسی اور ضرورت سے بھی نیچے اُترنے سے ہچکچاتا۔ بلکہ اونٹ کو بھی سانپوں کے ڈر کے مارے بیٹھنے تک نہ دیتا۔

ساربان اونٹ کو روٹ کے ایک طرف لے گیا۔ جہاں جھاڑیوں میں ایک چھوٹی سی ریتلی جگہ تھی۔ اونٹ کو بٹھا دیا گیا۔ ساربان نے میرے لئے اونٹ کی گلیم نیچے بچھا دی۔ مگر میں کچھ دیر سانپوں کے متعلق سوچتا ہوا کھڑا رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں لیٹ تو رہوں گا مگر سوؤں گا نہیں۔ اور اس جھاڑی کی طرف رُخ کر کے لیٹوں گا۔ جو گلیم کے بالکل قریب ہے۔ نیند کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ گلیم پر بستہ بچھا کر میں پتلون اور بوٹوں سمیت بستر پر لیٹ گیا

کچھ دیر تو کہنی پر سر رکھے میں چاندنی میں لسکتی ہوئی جھاڑی کو دیکھتا رہا۔ پھر ننھے ننھے مچھروں نے میری توجہ کلیتہً اپنی طرف مبذول کر لی۔ باجرے کے کھیت سے ہم اپنے ساتھ مچھروں کی ایک بڑی فوج لے آئے تھے۔ جو اب میرے سر کے گرد بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح منڈلا رہی تھی۔ یہ مچھر ننھناتے ہوئے میرے چہرے پر land کرنے کی کوشش کرتے۔ انہوں نے مجھے کاٹا بھی۔ مگر ان کی کاٹ ننھی اور غیر محسوس تھی۔ پھر بھی ان میں تنگ کرنے اور ستانے کی خداداد صلاحیت تھی۔ جذبۂ انتقام سے مجبور ہو کر میں نے چادر اوڑھ لی۔ چھوٹے مچھر یقیناً جھنجھلائے ہونگے۔ کچھ مایوس بھی ہوئے ہوں گے کہ اُن کے شکار نے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے یوں ستیہ گرہ کی ٹھان لی۔ کچھ دیر میں اپنے اوپر اُن کی غیظی ننھناہٹ سنتا رہا۔ اور پھر وہ مجھے چھوڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں میں جا ملے، جو اونٹ اور شتربان پر بلا روک ٹوک، بغیر کسی نوع کی مزاحمت کے، نہایت اچھا وقت گذار رہے تھے۔

میں نے سنا ہے کہ اونٹ ان ننھے صحرائی مچھروں کا بہشت ہے۔ شاید اونٹ کے جسم کی مخصوص بُو انہیں بھاتی ہے۔ یا وہ اسکی بے بسی اور بیچارگی کو پہچان چکے ہیں۔ ادھر وہ اونٹ کو دیکھتے ہیں۔ اُدھر ان کا ٹڈی دل حملہ آور ہوتا ہے۔ اور اتنے بڑے "زناور" کو بیحال کر دیتا ہے۔ میں نے کئی بار ڈہلو میں گاؤں کے باہر چراگاہ میں ساربانوں کو دیکھا ہے جو اپنے اونٹوں کو "دھواں دیتے" ہیں، —— دھواں تو شاملات کے میدان پر شام کے وقت ایک کہر کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اول اول دھواں دینے کا عمل مجھے مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ میرے وہمی دماغ نے تصور کیا۔ کہ یہ دھواں اونٹوں کے لئے شاید اتنا ہی سکون بخش ہے جیسے تمباکو انسان کے اعصاب کے لئے۔ مگر بعد میں ڈاکٹر سے استفسار پر معلوم ہوا۔ کہ مچھروں کو بھگانے کا حربہ ہے۔ اور نہایت کامیاب حربہ ہے۔ باوجود اسکے اگر آپ پہلی مرتبہ اونٹ کو "دھواں دیا جاتا" ہوا دیکھیں۔ تو اس رسم کا انوکھا پن آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لائے بغیر نہیں رہیگا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس وقت سویا۔ نیند ایک چور کی طرح آئی۔

اور میں اس ٹھنڈی سپید چاندنی اور دُور سے آتی ہوئی مدھم ٹنٹناہٹوں کی دنیا سے چپ چاپ ایک خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ مگر اس دنیا میں بھی چاندنی کی لو اور گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دیتی رہی۔ البتہ وہاں سانپ نہیں تھے —— ایک مرتبہ میری آنکھ کھلی۔ شتربان اپنے اونٹ کو باجرے کے ٹانڈے کھلا رہا تھا —— اونٹ کا منہ چارہ کاٹنے والی مشین کے مشابہ تھا جس میں لمبے لمبے ٹانڈے غائب ہوتے جا رہے تھے کچھ دیر کے بعد میرے ذہن پر سانپ رینگنے لگے میں بستر میں دبک کر سکتی ہوئی جھاڑی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب میں اُٹھا تو پو پھٹ رہی تھی، چاند کی سفید ٹکیہ اُسی طرح چمک رہی تھی۔ ستارے بھی اُسی طرح چمکیلے تھے، البتہ کبھی کبھی اُن کی لَوؤں میں پھیکے پن کا گمان سا ہوتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے طبعاً محسوس کیا۔ کہ میں نے آخر کار رات کو صبح کے ڈر سے دبے پاؤں بھاگتے ہوئے پکڑ لیا ہے۔ عناصر کی تمام کروٹوں میں سے یہی ایک کروٹ مجھے سب سے زیادہ دلآویز اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لمحے کی شیرینی صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں۔ جو گھروں کی چار دیواریوں کے باہر کھلی فضاؤں میں راتیں بسر کرنیکا تجربہ حاصل کر چکے ہیں۔ کیا کنجوس کروڑپتی کا سارا سونا اس ایک پل کا بدل ہو سکتا ہے۔ جب اشجار اور جھاڑیاں ایک نئی سانس لیتی ہیں۔ اور کائنات ایک انگڑائی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لمحے کی تاثر آفرینی کو صرف شاعروں اور مصوّروں۔ عاشقوں اور سیاحوں نے محسوس کیا ہے۔ اور ہمارے ہندوستان میں جوش نے محسوس کیا ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

میں نے دُور کسی گاؤں سے مرغے کی بانگ سنی، —— پھر مویشیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں —— پھر مدھم، بہت مدھم، کسی دہقان مؤذن کی اذان میرے کانوں میں آئی، جیسے کوئی آواز دے رہا ہو۔ اس کائنات کے رکھوالے کو، اور کہہ رہا ہو، کہ اس لمحے کو ابدی بنا دے، اس طلسم کو قائم رکھ، اے خدا —— اے خدا!

مگر یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ دھند پر اجالا غالب ہونے لگا! خدا کب سُنے گا انسان کی فریادیں مستجاب الدعوات کے دربار میں یہ ننھی مُنی معصوم دعائیں کب بار پا سکیں گی!

رات بھر کا تھکا ہارا ساربان لٹھ کی طرح سو رہا تھا۔ اور اس کا اونٹ ابوالہول کی طرح ماورائے فہم وادراک —— ایک عجیب مخفی اور ڈھکے چھپے انداز میں بیٹھا جگالی کر رہا تھا۔

اگر کوئی حیوان مشین سے کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے اس سے زیادہ مطمئن، بے اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں اسے غور سے دیکھئے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ اپنی خوراک میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا تاہم یہ ایک ناقابلِ تصور مقدار نگل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر دیر تک بیٹھے رہنا اس کے جذبات پر (اگر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں) ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتے جتنا سارا دن مسلسل چلتے رہنا۔ میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت برداشت اور لاابالیانہ پن نہیں جتنا اونٹ میں، اور اگر ایسے بزرگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے بزرگ بھی کبھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!

میں اب بہت جلد روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ساربان کو کچھ دیر سونے دیا۔ جب سورج کی خون آلود آنکھ جھاڑیوں کے اوپر مشرقی اُفق پر سے جھانکنے لگی، تو میں نے اُسے جگایا۔ اُٹھتے ہی اُس نے فوراً اونٹ پر پاکھڑا رکھا اور چند ہی منٹ میں تیار ہو کر ہم روانہ ہو پڑے، ہماری رفتار خاصی تھی، میں ساربان کی طرح ایک طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ میرے خیال میں اونٹ پر بیٹھنے کا یہ سب سے آرام دہ طریقہ ہے۔

اب ہم خدا کی جاگی ہوئی گلابی دنیا میں سے گزر رہے تھے۔ پرندے ہوا میں کلکاریاں مارتے اور چہچہاتے، ہمارے سر دُبکتے ہوئے درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے چھو جاتے، ایک درخت کے نیچے سے گزرتے وقت ایک شر بر شاخ نے میری سبز فلٹ

کو میرے سر پر سے اچک لیا۔ شاید پتوں میں چھپا ہؤا اور انسانی آنکھوں سے پوشیدہ کوئی ایریل (Ariel) یا پک (Puck) مسافروں کو ستانے کے لئے بیٹھا تھا۔ اور یہ اُسی کی کارستانی تھی۔ میری سبز فلٹ کانٹے دار شاخ میں اُلجھی ہوئی تھی۔ ساربان اونٹ کو واپس درخت تلے لایا، اور میں نے بڑی مشکل سے اُسے پک کی اُنگلیوں سے چھڑایا۔ اب میں نے ننگے سر بیٹھنا ہی بہتر سمجھا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ درخت شرارتوں اور چھیڑوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

پہاڑیوں کا لامتناہی سلسلہ کچھ دیر تک اسی طرح جاری رہا مگر تقریباً دو گھنٹوں کے بعد پہاڑیاں پست اور کم ڈھلائی ہونے لگیں، اب ہم ان بکھری پہاڑیوں کی دُم پر پہنچ گئے تھے۔ یہ بالکل مختلف اونچی زمین تھی۔ یہاں سے وہاں تک للا کی شکل کی تھوہر کی جھاڑیوں سے ڈھنپی ہوئی تھوہر کی اکا دکا جھاڑیاں ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھیں، مگر اس جگہ ان کی راجدھانی تھی۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تھوہر کی جھاڑی کوئی خوبصورت چیز نہیں، مگر یہاں اس انبوہ میں تھوہر حسین اور پُرشکوہ معلوم ہونے لگی تھی۔

اب ہم پہاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے، یہ پہاڑیاں اب ایک سرخ خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تھوہروں کی مملکت ختم ہو چکی تھی، ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گذرے، جس کے حاشیے پر شاندار درخت ایک زمردیں قطار کی طرح صف باندھے کھڑے تھے، ڈوڈوں میں کپاس کے پھول سفید ہیروں کی طرح دمک رہے تھے، مجھے اس سے پہلے کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے۔ مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً پہلا منظر تھا جس نے پہاڑیوں کے منظر کی یکسانیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اچانک باغِ ارم کی طرح مہک اُٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی میرا دل اچھلنے لگتا ہے۔

ہم ایک چھوٹی نہر کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر سے گذرے جہاں صحرائی سروٹوں کی ایک رجمنٹ ہماری سلامی کے لئے قطار باندھے کھڑی تھی ——— لمبے صحرائی سروٹ جن کی نرم ریشمیں جھالریں ہوا کی تھپکیوں سے جھکی پڑتی تھیں، کتنے خوبصورت لگ رہے تھے وہ سروٹ ——— اور وہ پیلے پھولوں والا اکیلا کیکر، نازنین سروٹوں کے درمیان ——— ایستادہ، پتوں میں صبح کا سونا لئے ——— کیا آپ نے بھی اس سے حسین چیز دیکھی ہے؟

مجھے ہر چیز حسین اور انوکھی معلوم ہو رہی تھی، شاید اس لئے کہ میں ایک تھکا دینے والے تسلسل کے بعد ایک خوشگوار تغیر سے دوچار ہو رہا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ یہ صبح گلابی اور سنہری تھی اور پرندے ہوا میں ناچ اور گا رہے تھے۔ یا شاید اس لئے کہ میں اب اس ابدی سفر کے خاتمے پر تھا۔

وہاں سے ہم ایک نابالغ نہر کے کنارے کنارے ہو لئے۔ میں نے یہاں سے پہلی بار نوکوٹ کے قصبہ اور اس سے پرے ریلوے اسٹیشن کا نظارہ دیکھا۔ اسٹیشن تنہا اور خاموش قصبے سے دُور پڑا تھا۔ ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح۔ یہی ننھا سا اسٹیشن میرا ایلڈوریڈو (El-dorado) تھا ——— وہ منزل جس تک پہنچنے کے لئے لوگ کئی برسوں کے جاں جوکھم سفر کرتے ہیں، ——— یہ میرا جادو کا قالین تھا۔ اور میں ابھی سے اُس سبز انجن والی چھوٹی ریل گاڑی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو دو گھنٹے کے بعد جھنجھناتی ہوئی مجھے اُٹھا لے جانے کے لئے اس اسٹیشن پر ٹھہرے گی۔

نوکوٹ تک پہنچنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ نہر کا پل دور تھا۔ اور اس کو عبور کرنے کے بعد ہمیں اُلٹے پاؤں پلٹنا پڑا۔ نوکوٹ کا قصبہ بالکل ایک مربعہ کی صورت میں تھا اور بیسویں صدی کے ایک جدید شہر کا ایک ایسا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جو کسی ناقابلِ فہم عمل سے اصل شہر سے علیحدہ ہو گیا ہو۔ اور علیحدگی کے اس سلسلہ میں پرانا، شکستہ اور بوسیدہ ہو گیا ہو۔ یہ اُن بدنصیب قصبوں میں سے ہے، جسے اسٹیشن سے دُور رہنے والے لوگ شہر سمجھتے ہیں۔ مگر جنہیں اپنی کم مائیگی کا پُورا علم اور احساس ہوتا ہے، اور جو اپنا سر شرم کے مارے ہمیشہ جھکائے رکھتے ہیں، نوکوٹ کے پاس تھکے ماندے مسافر کے لئے کوئی مسکراہٹ نہیں۔ کوئی تبسم نہیں محض ایک جذبات سے عاری نظر ہے، اچٹتی ہوئی اور پھیکی پھیکی ——— گھر تھوڑے، بدصورت، اور بے لطف ہیں،

اور وہ خانہ بدوش بھی (میں خانہ بدوشوں سے محبت کرتا ہوں) جو اپنے خیموں اور عجیب وضع کی بیل گاڑیوں اور اپنے پیشے کے زنگ آلود اوزاروں کے ساتھ شہر کے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں گدھوں کی ایک فوج معلوم ہوتے ہیں جو شہر کی گلتی سڑتی لاش کے پنجر پر دعوت اڑانے کے لئے جمع ہو گئے ہوں۔

ہم دو تین ہوٹلوں کے پاس سے گذرے جن میں سے ایک پنجابی لو آ رہی تھی وہ ان غلیظ، شوریدہ اور کھلے ہوٹلوں میں سے تھے جن میں کھانے کے علاوہ مسافروں کو چارپائیاں بھی مہیا کی جاتی ہیں اور جن کے تمام مشروبات و ماکولات کا ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے اور جن میں بڑے بڑے ترموں والے گراموفون دن رات گلا پھاڑ پھاڑ کر بکتے رہتے ہیں سننے اور سنانے والوں کے لئے یہ امر کسی طرح قابل لحاظ نہیں ہوتا کہ کونسا ریکارڈ بجایا جا رہا ہے خواہ پنکج ملک گائے یا کالو قوال (مع پارٹی) سننے والے کے لئے ایک ہی بات ہے وہ صرف پاگل کر دینے والا شور سنے گا۔ پنجابیوں کو ایسے خوفناک ہوٹل کھولنے کا خاص سلیقہ ہے جس ہوٹل کا گراموفون یا لاؤڈ سپیکر جتنا ہی زیادہ اونچا اور شوریدہ ہوگا اتنے ہی زیادہ گاہک ادھر کھچے چلے آئیں گے۔

سو ہم ہوٹلوں کے پاس سے گذرے خانہ بدوشوں کے خیموں کے پاس سے گذرے جو نوکوٹ اتنے رقبے میں پھیلے ہوئے تھے حکومت کے مسافرخانہ کے پاس سے گذرے ریلوے اسٹیشن کے سامنے جا کر ہم اترے اسٹیشن کے مسافرخانے میں صرف ایک شخص کھڑا تھا۔ اور وہ شخص ٹکٹ کلکٹر کے پھاٹک پر سے مجھے کچھ مشتبہ اور محتاط اور متجسس آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اس کی مونچھیں لمبی اور بالکل سیدھی اور نکیلی تھیں اور ایک دوسرے سے 180° کا زاویہ بنا رہی تھیں —— خط مستقیم سمجھئے لیکن "خط" سے مونچھوں کے پھیلاؤ پر حرف آتا ہے۔

اب جب سے میں نے ہردوار میں "لہری سوار" یا اسی قسم کی کسی فلم میں جسے فضل بک ڈپو کے کسی جاسوسی سنسنی خیز ناول کا فلم پورشن کہا جا سکتا ہے ایک سیدھی اور نکیلی مونچھوں والے "ولین" کو دیکھا ہے مجھے سیدھی اور نوکدار مونچھوں والوں کے متعلق ایک بدگمانی سی ہو گئی ہے ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل بے ضرر اور شریف آدمی ہوں اور اتنے سیدھے سادے جتنی ان کی مونچھیں مگر مجھے تو وہ چور اور جیب کترے اور ٹھگ اور خونی معلوم ہوتے ہیں میں ایک سیدھی اور نوکدار مونچھوں والے آدمی کے ساتھ کسی اندھیری رات کو اپنے گھر سے دس قدم سے زیادہ دور جانے سے ہچکچاؤں گا۔ اور پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ اس قسم کی مونچھوں والوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے وہی لال آنکھیں اور موٹی ناک اور ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی گالیاں —— مسافرخانے کا تن تنہا "باشندہ" مجھے عین مین لہری سوار کا شاندار اور پراسرار ولین لگ رہا تھا۔

ساربان نے میرا بستر اور کتابوں کی گٹھڑیاں اٹھا کر مسافرخانے میں پہنچا دیں وہ نیچے فرش پر رکھنے لگا تھا مگر لہری سوار کے ولین نے ایک میزبانہ خوش خلقی سے سامان کو پتھر کے بنچ پر رکھنے کے لئے کہا ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں دبکی ہوئی تھی۔

میں نے ساربان کو کرایہ دیکر رخصت کیا گٹھڑی کھول کر کتابیں نکال لیں اور ان کو بستر میں باندھ دیا۔ وہ شخص مجھ میں اور میرے سامان میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا۔ شاید میں اس کے لئے ایک معمہ تھا۔ آخر جب بستر باندھ کر میں نے اس سے وقت پوچھا تو وہ یہ کہتا ہوا اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کی طرف بھاگا "ٹھہریئے میں دیکھ کر آتا ہوں" —— واپس آ کر بولا "ابھی گاڑی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے گی۔ آپ شہر میں جا کر کچھ کھا پی آیئے میں آپ کے سامان کا خیال رکھوں گا"۔

—— مگر میں بچہ نہیں تھا۔ اور لہری سوار فلم میں اس کی چالبازیاں اور کرتوت دیکھ چکا تھا۔ میں ایک برتری کے انداز میں مسکرایا جس طرح ایسے موقعوں پر مسٹر شرلاک ہومز مسکراتا ہوگا۔

شہر جانے کے ارادے کو فی الحال ملتوی کر کے میں پتھر کے بنچ پر بیٹھ کر کیٹس کی "سوانح حیات" پڑھنے لگا۔ ......

Our adonais has drunk poison, oh!

وہ کوکی کوئل

سرلا دیوی

آج پھر سر میں ننھا ننھا درد گونج رہا ہے۔ آنکھوں میں بخار کی تپش بڑھ رہی ہے۔ اور جسم کے ہر حصہ میں تھکان کی انگڑائیاں چور چور ہو رہی ہیں۔ اس وقت سورج کی کرنیں کس قدر پیاری اور لذت انگیز معلوم ہو رہی ہیں ——— بالکل محبوبہ کی نیم گرم آغوش کی طرح — اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں دھوپ کی آغوش میں اپنے آپ کو سونپ دوں۔ اور سو جاؤں ——— ایک گہری نشیلی اور ابدی نیند۔

میں اپنی چارپائی کھینچ کر کھڑکی کے قریب دھوپ میں لے آیا ہوں۔ تاکہ کھڑکی کے باہر مناظر کو دیکھ کر بخار میرا پیچھا چھوڑ دے۔ درد کی شدت کم ہو جائے اور مجھے نیند آنے لگے ——— مدہم مدہم نشیلی لوریوں کی طرح۔ مگر میری طبیعت بدستور پریشان ہے۔ گو یہ جگہ ویران نہیں۔ غیر آباد نہیں۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے۔ میرے اردگرد اوپر نیچے ہُو کا عالم طاری ہے۔ اور میرے اندر درد گونج رہا ہے میری زندگی اب محض ایک بے معنی عمل ہو کر رہ گئی ہے۔

میں بھیڑ میں گھرے ہوئے انسان کی طرح بے بس۔ بے حس اور بے جذبہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ مگر اتنی قوت نہ تھی۔ کہ دنیا کے ہاتھوں سے اپنی خوشی چھین سکتا۔ اپنے ارادوں اور خوابوں کے زاویوں سے زندگی کی تعمیر کرتا۔ اپنی زندگی کو ایک نامعلوم سے سماجی خوف سے چھڑا کر یہاں بھاگ آیا ہوں ——— مگر تیری طرح نہیں۔ میری اور تیری حالت میں فرق ہے۔ ایک بہت بڑا فرق۔ تو اپنی مرضی سے یہاں نہیں آئی تھی۔ تو اپنی زندگی کے دھارے میں آنکھوں کا نور اور ہونٹوں کا شہد گھولنا چاہتی تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی غنچہ سامانی چاہتی تھی۔ مگر تیرے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ بالجبر تو یہاں پھینک دی گئی۔ اس ظلم کا احساس تیری آنکھوں کے گرد سیاہی کے حلقے ڈالنے لگا ہے۔ مگر بتاؤ ظلم کس کے ساتھ نہیں ہوتا! بیداد کون نہیں سہتا!

مگر میں بھی کتنا بیوقوف ہوں۔ کہ تمہارے متعلق اس قسم کی غلط غمناک قیاس آرائیاں کرنے لگا ہوں۔ مجھے تمہاری زندگی کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ صرف مجھے ایک چیز کا احساس ہے کہ تم غمگین ہو تنہا ہو مظلوم ہو ——— کیونکہ ٹھیک میری طرح جب تم مسکرانا چاہتی ہو تو تمہارے ہونٹ ہونٹ نہیں رہتے۔ وہ محض کچھ اور بن جاتے ہیں۔ جسم کے دیگر اعضا کی طرح۔ جو مسکرا نہیں سکتے۔

میں نے تم کو اکثر شام کے وقت خاموش اُداس آسمان کی وسعتوں میں گھورتے دیکھا ہے — جہاں بمبئی کے سمندر سے اُٹھتے ہوئے بخارات آسمان پر عجیب و غریب صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ زمین پر جھکتے آتے ہیں۔ تم ان کو اپنے ماضی کے دھندلکوں کی طرح دیکھنے لگتی ہو۔ اور پھر وہ اور تم ——— پانی کا جھرنا پھوٹ پڑتا ہے

ظلم دنیا میں خود انسان کی طرح پرانا ہے مجھے ظلم کے خلاف شکایت نہیں۔ مگر دنیا کی ستم ظریفی کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک آدمی کی انفرادی زندگی میں اکثر ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اسے ایسے حالات میں گرفتار کر دیا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں وہ اپنی خوشی کی خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ زندہ ہو کر بھی مردوں سے بدتر رہ جاتا ہے۔ تو اسے بتایا جاتا ہے۔ "ہم نے جو کچھ کیا تمہارے واسطے کیا"۔ دنیا کی اس ستم ظریفی کے خلاف میرے سینہ میں جذبۂ انتقام پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ مگر میں بغاوت کا قایل ہوتے ہوئے بھی عامل ہونے سے مجبور ہوں۔ کیونکہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اور زندگی کا راز دنیا کے اشاروں پر چلنے میں پوشیدہ ہے۔

تم مجھے پاگل تصور کرو گی کہ بنا تمہیں یہ بتائے ہوئے کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں۔ تم کو اپنی داستان سنانا شروع کر دی۔ مگر کیا کروں یہ میری ایک عادت ہو گئی ہے کہ میں جذبات کی رو

میں بہہ جاتا ہوں اور حقیقت کو بھول جاتا ہوں۔ دراصل یہ ہمارے دور ہی کی خصوصیت ہے۔ تلخی اور ناکامی نے ہر انسان کو فراری بنا دیا ہے اور خصوصاً بمبئی کے لوگوں میں یہ مرض پورے زوروں پر ہے۔ یہاں کے لوگ حقیقتاً بڑے عجیب ہیں۔ یہاں کا ہر نوجوان اپنے کو ایک ہوا ایکٹر تصور کرتا ہے۔ اور اگر تصور نہیں کرتا تو ایسا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں پر جی بھر کر گپیں ہانکی جاتی ہیں۔ ہوائی قلعے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ یہاں زندگی کی نہ صبح ہوتی ہے اور نہ شام محض وقت گذرتا جاتا ہے ——— افواہوں کی طرح۔

جب میں اپنے ماضی کی تاریکیوں میں ٹٹولتا ہوں تو یکایک مجھے محسوس ہوتا ہے۔ میری انگلیاں کسی کے خون میں لتھڑ گئی ہیں اور ایک سرد برفیلی پھریری میرے جسم میں منجمد ہو کر رہ جاتی ہے۔ گویا میں نے کوئی خون کیا ہے ——— مگر خدا کے واسطے تم مجھے خونی خیال نہ کر لینا۔ یہ محض ایک واقعہ کے شدید تصور کا اظہار ہے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ صرف ——— صرف کسی کو برباد کیا ہے۔ اسے دنیا میں کہیں کا بھی نہ چھوڑا۔ میں نے اسے ہڈی کی طرح چچوڑا۔ اور جونک کی طرح اس کی زندگی کی تمام راحتوں۔ لذتوں اور رعنائیوں کو چوس کر اسے دور پھینک دیا ——— مگر اس بیچاری نے اُف تک نہ کی۔ سچ داد دیتا ہوں تم عورتوں کی قوتِ برداشت اور صبر و تحمل کی ——— مگر شاید میری یہ گفتگو تم کو معموں سے زیادہ پیچیدہ اور خشک محسوس ہو رہی ہو گی۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا ——— میں واقعی بہت جلد بھول جاتا ہوں۔ اس طرح بھول جانا بھی ایک ذہنی مرض ہے۔ دراصل لگاتار ملیریا اور سر کے درد نے میرے ذہن کو کھوکھلا سا کر ڈالا ہے۔ اور میں مجبور ہوں۔

"میں مجبور ہوں" ——— میں نے اس سے بھی یہی کہا تھا۔ وہ رو پڑی تھی۔ مجھے اس کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی و تشفی دینے کی غرض سے کہا تھا۔ بھگوان تمہاری ضرور سنے گا۔ کتنا سادہ اور کتنا تلخ جواب اس نے دیا تھا۔ کہ اگر انسان ہی نہیں سن سکتا۔ تو خدا کیا سنے گا۔ تم پریشان ہو جاؤ گی۔ میری گفتگو واقعی مہمل اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں اس پرانے قصے کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو کبھی نیا نہیں ہوتا۔ اس المناک حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہوں جس کو میں بے معنی اور غیر ضروری خیال کر کے سگریٹ کے خالی ڈبہ کی طرح ماضی کی شاہراہ پر پھینک آیا تھا۔ مگر آج وہی حقیقت پارے کی طرح میرے وجود کے گوشہ گوشہ میں کروٹیں لے رہی ہے۔

ہاں تو ایک دفعہ میں اپنے ماما کے یہاں گیا۔ اور پہلی بار میں نے اُسے ——— نملا کو وہاں دیکھا۔ اُس کا قد چھوٹا تھا۔ بالکل ننھی منی گڑیا کی طرح۔ مگر اس کا جسم بھرا بھرا تھا اور اسکے خد و خال میں گویا یونانی مجسموں کی تراش خراش تھی۔ تم خود سمجھ سکتی ہو کہ گرمیوں کی چھٹیاں بنا کسی 'رومانس' کے کسی طرح بھی نہیں گذاری جا سکتیں۔ میں اپنے ماما کے یہاں۔ اُس دور دراز گاؤں میں محض وقت کاٹنا چاہتا تھا۔ اور اس لئے مجھے نملا سے دلچسپی پیدا ہو گئی محض اور خالص دلچسپی تھی۔ کیونکہ مجھے صرف وقت گذارنے کے وسائل کی تلاش تھی گو پہلے ہی دن مجھے بتایا گیا کہ نملا رشتہ میں میری بہن لگتی ہے۔ مگر مجھے اس بھائی بہن کے ڈھونگ میں قطعی ایمان نہیں۔ یوں تو دنیا کی تمام عورتیں ماں اور بہن ہوتی ہیں مگر آخر وہ ہی کسی دن بیویاں بن جاتی ہیں۔ پھر وہ محبوبہ کیوں نہیں بن سکتی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے بڑے بھائی کی شادی میں بہت سی لڑکیاں آئیں۔ مگر کچھ لطف نہ آسکا۔ ماں نے کونے میں لے جا کر کہا۔ دیکھ بیٹا۔ یہ سب تیری بہنیں ہیں۔ بالکل اپنی سی حالانکہ اسی رات کو ماں نے محض اس لئے رو کر اپنا حال بے حال کر لیا تھا کہ ان کے اپنی کوئی لڑکی نہ تھی۔

خیر مجھے معاف کرنا۔ میں بہک کر ترقی پسندی پر اُتر آیا ہوں۔ مجھے دراصل نملا کے ساتھ بھائی بہن کے ڈھونگ کو رچانے کا تصور ہی گوارا نہ ہوا۔ کیونکہ میں کسی گناہ کا ارادہ نہیں کر رہا تھا محض وقت کاٹنا چاہتا تھا۔ مگر میری کوری دلچسپی نہ جانے مجھے کس وقت اور کس طرف بہا کر لے گئی۔ کہ ایک دن نملا میرے پاس آ کر رونے لگی۔ اور معلوم نہیں اشاروں میں کیا کہہ گئی ——— معلوم نہیں یہ عورتیں بھی کیا بلا ہیں کہ انہیں چھوا نہیں کہ بس ——— میں تو

(باقی ص ۳۱ پر)

سشندر رہ گیا۔ میں نے اُسے دلاسا دیا اور کہا: بھلا رو مت۔ مگر اُس نے تو گویا چپ ہونے کی قسم کھائی تھی۔ میں غصہ سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ آخر کیا موت آگئی ہے جو یہ لڑکی مُنہ دھوئے چلی جاتی ہے۔

"مجھ سے شادی کرلو"۔ بھلا نہ جانے اب کیسے بول پڑی میرا تو دم نکلنے لگا۔ بھلا میں اس کے ساتھ شادی کر بھی کیسے سکتا تھا۔ اور پھر رشتہ کی وجہ سے میری شادی اس کے ساتھ ہو ہی کس طرح سکتی تھی وہ رشتہ میں میری بہن لگتی تھی۔ میں ہندو دھرم سے تعلق رکھتا ہوں ہمارے وید شاستر اس بات کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دے سکتے تھے ـــــ کیا کہا۔ کہ وقت کاٹنے اور اس معصوم لڑکی کے ساتھ یہ کھیل کھیلنے کی اجازت کس شاستر نے دی تھی۔ دیکھئے آپ کو غصہ آ گیا۔ میں دراصل مذہب اور سماج کے خلاف جانے کی جرأت نہیں رکھتا۔ اور پھر اتنی بڑی بدنامی کون اپنے سر لے .... میں ایک رات چپ چاپ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اور بمبئی آگیا پتا جی کو خط لکھ دیا۔ کہ ایک فلم کمپنی سے پیشکش آئی ہے۔ کافی مشاہرہ دینگے ـــــ مجھے نہیں معلوم بھلا کا کیا ہوا۔ میں گڑے مردے نہیں اکھاڑنا چاہتا۔ یہاں آکر میں ایکٹر تو نہ بن سکا۔ مگر ایک فلم کمپنی میں کلرک ضرور ہو گیا ہوں۔

اُف میرے سر میں پھر درد جاگ اُٹھا ہے۔ شدید ننھی ننھی ضربوں کی طرح۔ اس وقت کوئی میرے پاس نہیں۔ صرف تنہائی اور ویرانی کا دائرہ میرے گرد تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

اس وقت مجھے کسی کے نرم نرم گداز ہاتھوں کی ضرورت ہے اپنے بالوں میں کسی کی انگلیوں کے ریشمی لمس کی خواہش ہے۔ مگر میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ میرے پاس کوئی نہیں..... صرف میزیں ہیں۔ کرسیاں ہیں۔ چارپائیاں ہیں۔ میں بے جان۔ بے حس۔ اور مردہ چیزوں کے درمیان گرفتار پڑا ہوں۔

نہیں معلوم اس محلہ کی تمام لڑکیاں کہاں مر گئی ہیں۔ ایسے مقام پر رہ کر اگر سر درد نہ ہو تو کیا ہو۔ حالانکہ یہ جگہ ویران نہیں۔ عمدہ عمارتیں شاداب باغات اور پختہ سڑکیں۔ مگر اینٹ اور پتھر کی اس نفاست میں رنگ نہیں۔ نور نہیں۔ لچک نہیں۔ کپکپی نہیں۔ نغمہ نہیں ـــ صرف سامنے والی سڑک پر فوجی گاڑیوں اور ٹھیلوں کی کھڑ کھڑ دن رات لگی رہتی ہے۔

جب رات کو چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے اور سکوت بندھ جاتا ہے۔ اور آسمان پر صرف تارے آنکھیں مٹکاتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی یہاں پر کرخت آوازوں کا شور خموشی کو۔ نیند کو۔ نشہ کو اور خوابوں کو توڑتا رہتا ہے۔ یہاں قطعی راحت نہیں مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے۔ یہ میرا ماضی مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ مگر یہ فوجی گاڑیوں اور ٹھیلوں کی مسلسل نقل و حرکت تو جنگ کا نتیجہ ہے۔ اور جنگ میرے ماضی کی نہیں خود تمام انسانیت کے ماضی کا انتقام عظیم ہے۔

اس جذباتی گھٹن اور بے کیف زندگی کو برداشت کرتے کرتے ایک سال گزر گیا ہے۔ زندگی میں رس نہیں۔ میری زندگی کسی خشک نالے کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔ میں بار بار سمندر کے کنارے گیا ہوں۔ اس کی سرمئی لہروں میں سورج کے دہکتے سونے کو گھلتے دیکھا ہے۔ اور تاڑ کے درختوں کے پنکھوں پر بارش کی پھواروں کو دل کی دھڑکنوں سے کچھ جھلی سی کھاتے سنا ہے۔ مگر صبر نہیں۔ قرار نہیں۔ صرف اپنی ویرانی اور پ... سے بیزار ہو کر جب ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا ہوں تو میری نگاہیں تجھ پر آکر رک جاتی ہیں۔ اور میں تجھے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔

جب میں یہاں آیا تھا تو تمہارے بنگلے میں محض ایک موٹی سی بھدی عورت تھی۔ اس کا رنگ حد سے زیادہ سیاہ ہے مگر بیچاری کو جوڑے میں پیلے رنگ کے پھول ٹھونسنے کا شوق ہے۔ میں نے اکثر اسے اپنے دو بچوں کو پیٹ کر باہر لاتے ہوئے اور چپ کرا کے اندر لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ صرف دو ماہ سے میں تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں ـــ میں نہیں جانتا تم کہاں سے آئی ہو۔ تمہارا کیا نام ہے۔ صرف میں نے دیکھا ہے کہ اپنے گھنے گیسوؤں کو لاپروائی سے کھول کر بنگلہ کے باہر والے لکڑی کے جنگلہ پر آکھڑی ہوتی ہو۔ اور کھڑی رہتی ہو مغموم۔ اُداس اور خاموش۔ میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تم نے اپنے ان بیش قیمت

ریشمی تاروں کو اس طرح کیوں بکھیر رہا ہے۔ تم خاموش اور اُداس کیوں رہتی ہو۔ تم ہمیشہ اس لکڑی کے حقیر جھونپڑے کو کیوں دیکھتی رہتی ہو۔ میری طرف دیکھو۔ میں حسین نہیں ہوں۔ تندرست نہیں ہوں۔ فنکار بھی نہیں مگر میں مغموم ہوں۔ اُداس ہوں۔ اکیلا ہوں۔ جلاوطن ہوں تمہاری طرح۔

ہاں بالکل تمہاری طرح کیونکہ میں تمہارے متعلق تو نہیں جانتا۔ مگر تمہارے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر خاموش ہو جانے والی آرزو۔ تمہارے سینہ میں بیٹھنے والے غم اور تمہاری آنکھوں میں سلگنے والی اندوہگین حسرت سے ضرور واقف ہوں۔ جب کووں کا بسیرا ختم ہو جاتا ہے۔ تاریکی غم کی طرح درودیوار پر برسنے لگتی ہے۔ سورج اپنی ایک ایک زریں کرن بٹور کر سمندر کے پار چلا جاتا ہے۔ تمہارے بنگلہ کے گرد تمام پیڑ کالے کالے بھوتوں کی طرح گھیر کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو تم چپکے سے اس لکڑی کے جنگلے کے پاس آ کھڑی ہوتی ہو۔ گرد۔ غبار۔ کہر۔ دھواں۔ تاریکی سب مل کر تم پر برس پڑتے ہیں۔ تم اندھیرے میں کھو جاتی ہو۔ تمہارا حال اور مستقبل تمہیں سیاہ چادروں میں لپیٹ کر میری زندگی سے اوجھل کر دیتا ہے۔

اسے ہٹے؟ مگر ٹھیک اس وقت جب تم۔ تمہارا حال اور تمہارا مستقبل تاریکی اور سیاہی میں کھو جاتا ہے۔ تو میرے ذہن میں تمہاری چند دن پیشتر کی ایک تصویر ابھرتی ہے۔ تم ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ اسی لکڑی کے جنگلے کے قریب کھڑی تھیں اس دن تم جی بھر کر باتیں کر رہی تھیں۔ شانوں سے بار بار کھسک جانے والے آنچل کی طرح ہنسی تمہارے ہونٹوں پر بکھری پڑتی تھی۔ تمہارے دانتوں میں سچے موتیوں کی جگمگاہٹ تھی۔ تمہاری کمر میں لاجونتی کی بیلوں کا لوچ بھر گیا تھا اور چوڑیوں کی چھنک کی طرح تمہارے قہقہے گونج رہے تھے۔ اور وہ نوجوان تمہارے قریب کھڑا ہوا تمہیں پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

مگر صرف اس دن — اور اس کے بعد میں نے تمہیں گفتگو کرتے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اس دن کے بعد وہ خوبصورت نوجوان بھی دکھائی نہ دیا۔ نہیں معلوم اتنی جلدی وہ کیوں اور کہاں چلا گیا۔ مجھے صرف ایک بات معلوم ہے۔ کہ تمہیں گھن سا لگ گیا ہے۔ تمہاری آنکھیں۔ تمہارے ہونٹ تمہارے دانت سب گہنانے لگے ہیں۔

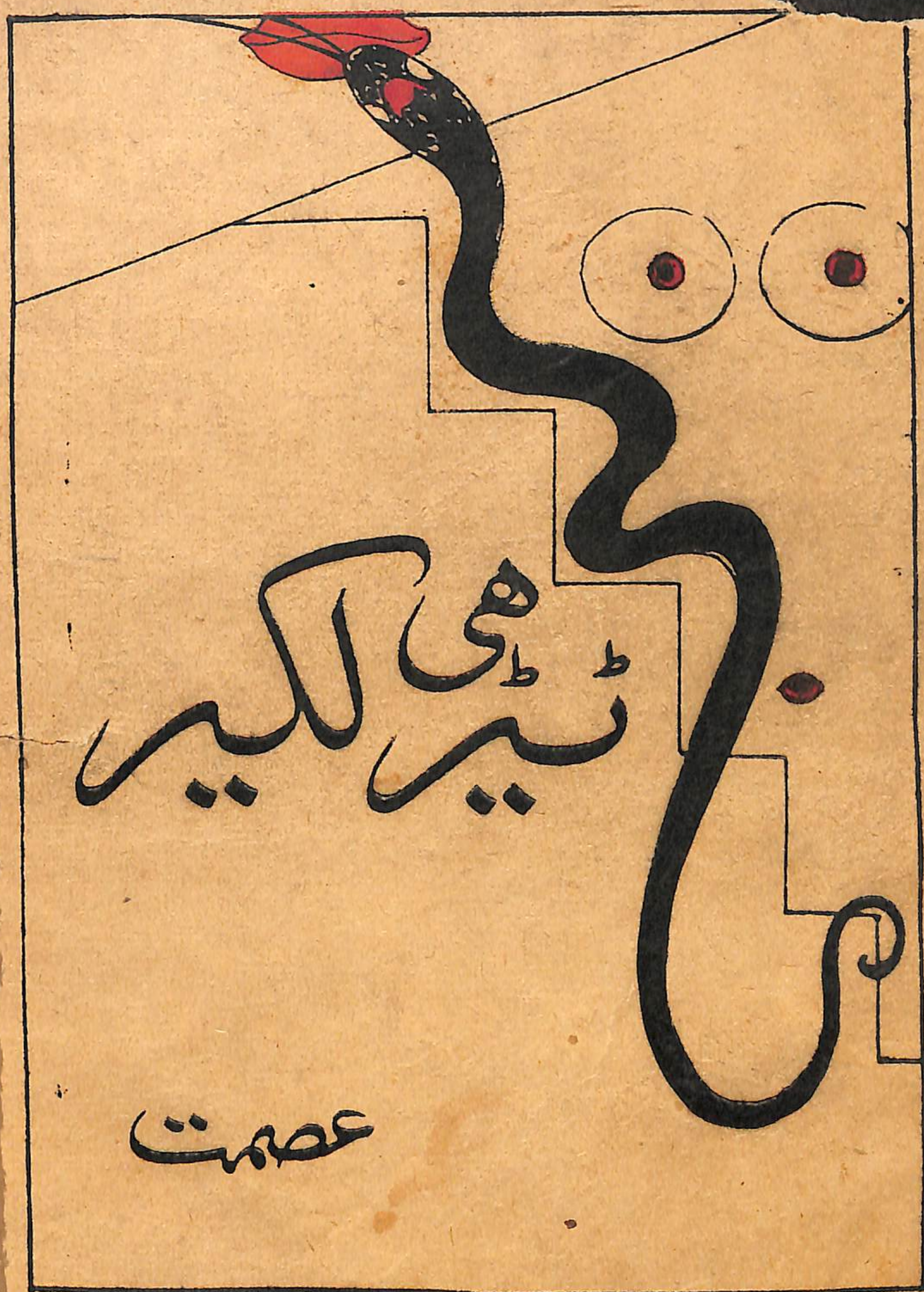
میں تم سے کہتا ہوں۔ پرانی باتوں کو فراموش کر دو۔ اپنے سینہ کے خلا میں غم و اندوہ کو مت سما جانے دو۔ اپنے ہونٹوں سے یاسیت کے لاکھے کو پونچھ ڈالو۔ اور خدا کے واسطے ایک بار بولو۔ مسکراؤ۔ ہنسو۔ اور میری طرف دیکھو۔ میری زندگی کی وسعتیں بھائیں بھائیں کرتی ہیں۔ میرے دل میں گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے مجھے اپنی لاہوتی موسیقی کے چند نغمے بخش دو۔ اپنی آنکھوں کے تیکھے تیکھے دوج کے چاند عطا کر دو۔

اوہ یہ کیسی چیخ تھی۔ دیکھو تاریکی کے سینے میں یہ چراغ تازہ زخم کی طرح رسنے لگا ہے۔ آج تمہارے خاموش ہونٹوں سے کس نے یہ دردناک لرزتی ہوئی طویل چیخ کھینچ لی۔ کس نے تمہاری زندگی کو تمہارے شیریں ترین خوابوں کے تاروں سے نوچ کر چھٹا لیا۔ رومت میری محبوبہ۔ میری غمگین محبوبہ۔ چپ ہو جاؤ۔ تمہاری گھٹتی ہوئی چیخیں مسلسل خاموشی کے سینے کو ڈسے جا رہی ہیں۔ مجھے بخش دو میرے محزوں ہمراز۔ مجھے تم سے اب کچھ نہیں چاہئے۔ صرف میں تم کو دیکھتے رہنا چاہتا ہوں — اپنے اور تمہارے خدا کی طرح خاموش۔ بے زبان۔ بے آواز۔ کیونکہ مجھے تم سے اُنس ہو گیا ہے — نہیں مجھے تمہارے غم۔ تمہارے حزن۔ تمہارے سوز۔ تمہارے المیہ سے عشق ہو گیا ہے۔ اب اپنی زندگی کے اندوہ و غم۔ یاس و ناامیدی میں مجھے تنہائی کا احساس کاٹنے نہیں دوڑتا۔ وہاں تم ہوتی ہو۔ تمہاری آنکھیں ہوتی ہیں۔ تمہارے ہونٹ ہوتے ہیں۔

مگر آہ تم نے یہ کیا کھیل کھیلا۔ تم آخر یہاں آئی ہی کیوں تھیں اور آئی تھیں تو اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو۔ یہ تمہارا بنگلہ کیوں سجنے لگا۔ یہ بینڈ اور شادیانے کیوں بجنے لگے۔ یہ آدمیوں کا ہجوم کیوں بہا آ رہا ہے۔ یہ تم گٹھڑی سی کیوں بنی جا رہی ہو۔ یہ لال جوڑا



Shrimant.



ادب لطیف

Brij Mohan Puri Esqr.

MAY, 1946

جلد ۲۳ - شمارہ ۲

لکھنے والے

اثر لکھنوی — عبادت بریلوی

ابوالفضل صدیقی — چوہدری شیر جنگ

ڈاکٹر محی الدین زور — مخمور جالندھری

خالد ندیم — سولا دیوی

Annas -/8/-

مکتبہ اردو